38

علمی و تحقیقی مجلہ

عورت، مغرب اور اسلام

ثروت جمال اصمعی

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔ اسلام آباد

38

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

مدیر معاون: متقین الرحمٰن

علمی و تحقیقی مجلہ

مقالہ خصوصی

عورت، مغرب اور اسلام

ثروت جمال اصمعی

جلد ۱۵، شمارہ ۱: ۲۰۱۲ کا پہلا شمارہ

تعارف

—— ''کیا عورتوں کا کام بس بچے پالنا اور چولہا جھونکنا ہے؟''

—— ''ہم اپنی نصف آبادی کو گھروں میں بند رکھ کر بھلا کیسے ترقی کر سکتے ہیں؟''

—— ''مغرب کی ترقی کا راز معاشی جدوجہد میں عورت کی شرکت میں مضمر ہے''

—— ''جب تک عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر میدان میں کام نہ کریں، ترقی ممکن نہیں''

یہ فقرے ہم اکثر سنتے رہتے ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے؟

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مغرب نے عورت کو گھر سے نکال کر اور معاشی جدوجہد میں ایک اہم مقام دے کر اس کی بڑی عزت افزائی کی ہے اور اسے مردوں کے مساوی مقام عطا کر دیا ہے۔ کیا یہ رویہ مغربی عورت کے خیال میں اس کے مقام و مرتبے کا بحیثیت عورت اعتراف و احترام ہے یا انکار؟ اس سے جڑا ہوا سوال یہ ہے کہ مغرب کی عورت اگر معاشرے میں اس مقام اور مرتبے سے مطمئن ہے جو مغربی تہذیب نے اسے دیا ہے تو مغربی عورتوں میں اسلام کی روز افزوں مقبولیت کی کیا وجہ ہے جبکہ اسلام مردوں اور عورتوں کے لیے واضح طور پر الگ الگ دائرہ کار متعین کرتا ہے؟

اس مختصر مطالعے میں حقائق اور واقعات کی بنیاد پر ان ہی سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فہرست

ثروت جمال اصمعی

جناب ثروت جمال اصمعی پاکستان کے سینئر صحافی ہیں۔آپ نے ۱۹۷۰ء میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔فروری ۲۰۰۰ء سے روزنامہ جنگ سے وابستہ ہیں۔ عالمِ اسلام ان کا خصوصی موضوع ہے۔اس حوالے سے ان کے کالم جنگ کے ادارتی صفحے پر شائع ہوتے رہتے ہیں۔۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۳ء تک انہوں نے روزنامہ جسارت کراچی میں سب ایڈیٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹر اور پھر میگزین ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۹ء تک ہفت روزہ تکبیر کراچی میں ڈپٹی ایڈیٹر اور پھر چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمہ داریاں انجام دیں۔ آپ ۲۰۰۷ء سے عالم اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے مختلف پراجیکٹس میں معاونت کررہے ہیں۔

ابتدائیہ

حقوق نسواں : چند زمینی حقائق

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے پائے جانے والے تاثرات میں مسلم معاشروں میں عورت کا مقام و کردار ایک مرکزی موضوع کا مقام اختیار کر گیا ہے اور بعض غلط العام تاثرات کی تکرار نے بہت سے مسلم اہل قلم کو مدافعانہ انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ کسی بھی عصری مسئلہ کا علمی جائزہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ پہلے اس مسئلہ کی نوعیت، اس کے اسباب اور اس سے نکلنے والے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے معروضی طور پر یہ دیکھا جائے کہ جس بنیاد پر دلائل کی عمارت تعمیر کی گئی ہے کیا وہ درست ہے یا اس کی ٹیڑھ پوری عمارت کے ایک جانب جھک جانے کا سبب ہے اور کیا واقعی مقصود ایک ٹیڑھی عمارت ہے یا سیدھی تعمیر۔

تقابلی مطالعوں میں عموماً ایک محقق کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس مواد کو یکجا کر دے جو تحقیقی مفروضہ سے مطابقت رکھتا ہو اور منطقی طور پر وہ نتیجہ حاصل کر لے جو پہلے قیاس کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ اکثر مغربی تحریرات کا آغاز مسلم دنیا میں پائی جانے والی چند بے ضابطگیوں سے ہوتا ہے جنہیں عموم کا مقام دے کر وہ نتیجہ حاصل کر لیا جاتا ہے جس کو مستحکم کرنے کے لیے مواد جمع کیا گیا تھا۔ مجھے اس امر کا پورا احساس ہے کہ کوئی انسان جو کسی معاشرہ اور کسی علمی روایت سے وابستہ ہو مکمل طور پر اپنے آپ کو اپنے ثقافتی ماحول سے آزاد نہیں کر سکتا لیکن اگر ایک محقق کو اپنی محدودیت اور اپنے تصورات کا پورا ادراک ہو اور ساتھ ہی وہ دیگر نظریات کو عادلانہ نظر سے دیکھے جس کا حکم قرآن کریم نے شہادت کے حوالہ سے دیا ہے کہ چاہے وہ شہادت ایک فرد کے خونی رشتہ دار ہی سے تعلق رکھتی ہو، شہادت حق ہی ہو اور اس میں رشتہ کا تعصب نہ آنے پائے۔ چنانچہ علمی جائزہ میں

بھی اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ ایک مسلمان محقق اسلامی نظام حیات کی حقانیت پر ایمان رکھتا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات اور دیگر تصورات کو معروضی طور پر ایک کھلے ذہن کے ساتھ اور پہلے سے تصور کردہ مفروضوں سے نکل کر جائزہ لینے کے بعد ایک قول فیصل تک پہنچے۔

اس بنیادی اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو عصر حاضر میں مغربی فکر اور مغرب زدہ مفکرین جن امور پر اپنی توجہ مرتکز کرتے ہیں انھیں اسلام میں خواتین کے حقوق خصوصی دلچسپی کا باعث نظر آتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ خود مسلم اہل فکر نے اس موضوع پر یا تو فقہی نقطۂ نظر سے فقہی احکام کی تشریح کرتے ہوئے عورت اور مرد یا شوہر اور بیوی کے حقوق پر سیر حاصل بحث کی ہے یا بعض اختلافی مسائل میں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے قانون اور فقہی آراء کا دفاع کیا ہے۔ چنانچہ حدود اور قصاص و دیت کے معاملات میں ایک عورت کی شہادت کی حیثیت کیا ہوگی، وراثت میں تقسیم کا جو تناسب اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے اس پر کوئی ''نظر ثانی'' ہوگی یا نہیں۔ ایک شادی شدہ شخص کو دوسری شادی کرنے کا اختیار ہے یا نہیں اور ریاست اس سلسلے میں کیا قدغن لگا سکتی ہے وہ موضوعات ہیں جو توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

اسلامی قانون کے حوالہ سے بحث کرتے وقت عموماً جو رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔ اکثر مغربی جامعات سے فارغ مسلم مفکرین مغربی فلسفۂ قانون کے مطالعہ اور اس کے بنیادی مفروضوں پر ایمان لانے کے بعد اسلامی فقہ اور قانون کے بارے میں اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ چونکہ فکری بنیاد مغربی فلسفۂ قانون ہوتا ہے، اس لیے بار بار وہ سوالات اٹھائے جاتے ہیں جو نہ تو نئے ہیں اور نہ منطقی طور پر صحت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قانون جو ساتویں صدی عیسوی میں یا نویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا آخر کس طرح اکیسویں صدی کے تغیر شدہ ماحول و حالات میں قابل عمل ہو سکتا ہے یا یہ کہ قرآن کے احکامات جو خواتین سے متعلق ہوں یا مردوں سے یا معاشرہ کے مسائل سے، آج کس طرح نافذ ہو سکتے ہیں جبکہ ہم ''بدوی'' معاشرہ سے آگے نکل چکے ہیں!

خواتین کی قانونی شہادت، وراثت میں تناسب، تعلیم کا حصول، گھر میں فیصلہ کن معاملات

میں مقام، سیاسی کردار، معاشی میدان میں عمل دخل، فوج اور پولیس میں یکساں نمائندگی، نکاح میں مرد کی طرح ایک سے زائد شوہروں سے زواج قائم کرنا، نماز میں امامت اور جمعہ کا خطبہ دینا وغیرہ وہ مسائل ہیں جن پر اس انداز سے بات کی جاتی ہے گویا یہ مسائل اچانک دریافت کر لیے گئے ہیں اور شارع اعظم اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کے علم میں ان کا کہیں آس پاس بھی سراغ نہیں پایا جاتا تھا ان مسائل سے لاعلمی میں ایک شریعت ہمیں حوالے کر دی گئی اور اب چونکہ یہ مسائل یکا یک دریافت ہو گئے ہیں اس لیے وہ شریعت جو ان سے لاعلمی کی بنا پر بنی تھی خود بخود اپنی قانونی قوت کھو بیٹھی ہے!

علمی اور معروضی تحقیقی حکمت عملی کا بنیادی مطالبہ ہے کہ پہلے یہ بات طے کر لی جائے کہ شریعت ہے کیا؟ کیا یہ ایک مردانہ ذہن کے پیدا کردہ تصورات اور حدود و قیود پر مبنی ہے یا اسے خالق کائنات اور صانعِ انسان نے انسان اور انسانی معاشرہ کی ضروریات، مستقبل کے مطالبات اور ضروریات کے پیش نظر نازل کیا ہے؟ اگر شریعت زمان و مکان کی قید میں ہے تو لازماً اسے تغیر و تبدیلی سے گزرنا ہوگا لیکن اگر شریعت زمان و مکان کی قید سے آزاد اُن آفاقی اصولوں پر مبنی ہے جن پر انسانی خمیر کی تعمیر کی گئی ہے تو اس میں آفاقیت ہوگی اور تبدیلیٔ زمان و مکان سے اس کی قانونی قوت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

مرد اور عورت سے متعلق جو ہدایت نامہ قرآن کریم کی شکل میں اور اس کا عملی نمونہ حیات مبارکہ سید الانبیاء خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں ہمارے سامنے رکھا گیا ہے ان دونوں میں عدم تغیر، آفاقیت اور عالمگیریت کو اپنی مکمل شکل میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس بنا پر قرآن کریم نے سنت کو تشریعی مقام دیا ہے۔ سنت مدینہ اور مکہ کی زمانی و مکانی قید سے آزاد ہے۔ یہ اسوۂ حسنہ محض اخلاقی نصائح تک محدود نہیں ہے یہ حدود کے اجراء، بین الاقوامی معاہدات، سفراء کے تقرر، قاضیوں اور مفتیوں کی نامزدگی، زکوٰۃ کے نصاب، مرتدین کے خلاف قتال، معاندین زکوٰۃ کی سرکوبی، غرض ان تمام معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو منصب نبوت کے فرائض میں شامل تھے۔

بعض سادہ لوح افراد قرآن فہمی کے دعووں کے ساتھ جب یہ بات کہتے ہیں کہ قرآن میں تو رجم کا ذکر نہیں پایا جاتا تو یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن کریم شارع اعظم کو حکماً یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ تحلیل وتحریم کریں نتیجتاً ان کے تحکیم کردہ معاملات کو حتمی مقام حاصل ہو جاتا ہے۔" (پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس رسول نبی امّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے بدی سے روکتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔" (الاعراف ۷:۱۵۷) یہاں پر نشان زدہ حصہ براہ راست رسول کو تحریم وتحلیل کا اختیار دیتا ہے۔

اس بنا پر کہا گیا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ اللہ کے فیصلے کی طرح ہے اور جو اس فیصلہ کو قرآن کے احکامات سے الگ سمجھتا ہے اس کا مقام ومرتبہ ایمان سے گرا ہوا ہے۔ ایمان کی شرائط میں سے یہ شرط قرآن کریم خود بیان کرتا ہے کہ جب تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور فیصلہ کو کشادہ دلی کے ساتھ بلا کسی تردد وتعمل کے نہ مانا جائے اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہوسکتا ہے "نہیں، (اے محمدؐ) تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بہ سر تسلیم کرلیں" (النساء۴:۶۵) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اللہ سبحانہ کی اطاعت قرار دیتے ہوئے فرقان حکیم فرماتا ہے "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا، تو بہرحال ہم نے تمہیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے" (النساء۴:۸۰) اس سلسلے میں حرفِ آخر وہ فرامین ہیں جو یہ کہتے ہیں "مومنو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو" (محمد۴۷:۳۳) مزید یہ کہ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں" (النساء۴:۶۱)

اس ضمنی توضیح سے قطع نظر جو بات بلا جھجک کہنے کی ضرورت ہے وہ بہت آسان ہے: اولاً اسلام اپنے تصور عدل کی بنا پر مرد اور عورت دونوں کے حوالہ سے جو ہدایات دیتا ہے ان کی بنیاد جنسی تفریق نہیں ہے جبکہ مغربی اور مشرقی فکر چاہے وہ مذہبی مصادر میں ہو یا معاشرتی علوم میں اس کی بنیاد جنس (Gender) کی تفریق (Discrimination) پر ہے۔ چنانچہ اسلام نے جو حق خواتین کو ساتویں صدی عیسوی میں دیا کہ وہ ریاستی امور میں اپنی رائے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر دیں (حضرت عثمان کی خلافت کے انتخاب کے موقع پر مدینہ کے ہر گھر کی خواتین سے ان کی رائے سرکاری طور پر لی گئی) وہ حق یورپ میں ۱۸۹۲ء میں صرف اصولی طور پر تسلیم کیا گیا جبکہ اس پر عمل بیسویں صدی میں ہوا۔

آج بھی مغرب اور مشرق میں خواتین کاغذی حد تک تو بعض حقوق رکھتی ہیں لیکن زمینی حقائق اس سے متضاد صورتِ حال پیش کرتے ہیں۔

اسلامی نظام حیات کا بنیادی نکتہ عدل ہے۔ عدل اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ایک فرد پر اس کی برداشت اور استعداد سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے اس کی وسعت کے لحاظ سے اس کی جوابدہی ہو، قرآنی اصول کسی تعارف کا محتاج نہیں کہ "لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا" اللہ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ (البقرہ ۲:۲۸۶)

چونکہ اسلام ایک مہذب معاشرہ کے قیام کے لیے خاندان کو بنیادی ادارہ قرار دیتا ہے اور مذاہب عالم کے تمام تصوراتِ "تقویٰ و پاکبازی" کے برخلاف رشتہ ازدواج اور شوہر اور بیوی کے صحت مندانہ اخلاقی تعلق کو تقویٰ اور ایمان کی علامت سمجھتا ہے اس بنا پر عدل کا مطالبہ ہے کہ خواتین کی سیاسی، معاشی، معاشرتی سرگرمیوں کو خاندان کے تناظر میں دیکھتے ہوئے شریعت کے بنیادی مقاصد اور "مصلحہ" کو سامنے رکھتے ہوئے ایک عادلانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ اسلام میں شادی کا مقصد ایک "کماؤ بیوی" کا حصول نہیں ہے بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کی معمار اور گھر کے اندر سکون، رحمت اور مودّت کا ماحول فراہم کرنے والی بیوی کا حصول ہے۔

اسلام کا تصورِ اجتماعیت اس کے عدلِ اجتماعی سے منطقی طور پر وابستہ و پیوستہ ہے اور یہ تصور مغربی اور مشرقی تصورِ انفرادیت کی مکمل ضد ہے۔ اس میں فرد کو جائز قانونی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مقام کا تحفظ دیتے ہوئے معاشرتی رشتے میں جوڑا گیا ہے جبکہ دیگر نظاموں میں، وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، فرد کو عبادات میں محض اپنے خدا سے رشتہ جوڑنے کا تصور اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ مشرقی اور مغربی تصورِ عبادت یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہب God اور بندے کے درمیان ایک نجی (Private) اور ذاتی (Personal) رشتہ ہے۔ اسلام اس کی تردید کرتے ہوئے حکم دیتا ہے کہ نماز جماعت کی شکل میں قائم کرو اور اجتماعی طور پر نہ صرف نماز بلکہ صیام، حج اور زکوٰۃ کو ادا کرو۔ قرآن کریم ان عبادات کے لیے ریاست کو ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ ان کے قیام اور تحفظ کے لیے اپنی قوت نافذہ کا استعمال کرے۔ یہ بنیادی نظریاتی فرق اگر سامنے نہ رکھا جائے تو پھر اہل علم بھی اس دوڑ میں لگ جاتے ہیں کہ مغرب یا مشرق عورت کو کون سے ''انفرادی حق'' دیتا ہے اور مقابلتاً اسلام کون سے ایسے حقوق دیتا ہے۔

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انفرادی حقوق کی دوڑ میں کون کس سے آگے ہے، مسئلہ یہ ہے کہ عدل کس بات کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیا یہ عدل ہوگا کہ ایک خاتون سے یہ کہا جائے کہ وہ اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرے، ایمان کی تکمیل کے لیے شادی کرے اور اپنی خاندانی ذمہ داریوں کو جو وہ ایک عقد (Public Contract) کے ذریعہ اختیار کرتی ہے پوری ذمہ داری سے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صبح سے شام تک کم از کم ۸ گھنٹے ایک معاشی کارکن کے طور پر کام کرے اور جب گھر واپس آئے تو پھر اپنے خاندانی وظائف میں مصروف ہوجائے اور اس بات پر فخر کرے کہ وہ ''مرد کے شانہ بہ شانہ'' ''معاشی دوڑ'' میں اپنا کردار ادا کررہی ہے! چاہے اسے اس دوڑ کے لیے اپنے اعصابی تناؤ کو قابو میں رکھنے کے لیے صبح شام ادویات کا استعمال کرنا پڑے، ہر روز کام پر جانے کے لیے دو گھنٹے سخت ہجوم میں ٹیکسی، بس یا اپنی ذاتی گاڑی میں سفر کرنا پڑے اور دفتر میں Sexploitation کا نشانہ بننا پڑے، لیکن وہ یہ سب کچھ اس لیے کرے کہ مغربی اور مشرقی تہذیب ایک Working

Lady کو زیادہ Productive کہتی ہے! اگر معروضی طور پر صرف اس آمدنی اور اس خرچ کا ایک میزانیہ تیار کر لیا جائے جو ایک Working Lady اپنی ''دفتری ضرورت'' کے طور پر ذاتی تزئین پر خرچ کرتی ہے تو ''معاشی ترقی'' کے غبارہ سے ہوا نکل جائے گی اندازہ ہو جائے گا کہ جو آمدنی گھر لائی جا رہی ہے اور جس کا تذکرہ بطور ''دو تنخواہوں'' کے ہر صحافیانہ تحریر میں پایا جاتا ہے وہ اصلاً کتنی آمدنی ہے۔

مسئلہ آسان ہے مغرب و مشرق کا ذہنی سانچہ جنسی تقسیم اور استحصال پر مبنی ہے مغرب کی پوری تہذیب میں، جواب مشرق میں بھی عام ہے، عورت ایک ''شے'' (Comodity) سے زیادہ مقام نہیں رکھتی اور وہ بھی ایسی شے جسے exploit کر کے ایک مردانہ معاشرہ اپنے مقاصد حاصل کرے۔ اس کے برخلاف اسلامی شریعت کی بنیاد عدل کے اصول پر ہے جو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کسی فرد پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ اور اسے اس کی ذاتی حیثیت میں اور اجتماعی حیثیت میں یکساں حقوق حاصل ہوں۔

مسلم اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی شریعت کے آفاقی پہلو کو اور اس کے نتیجے میں ایک ایسے انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کو جو عدل اجتماعی پر مبنی ہو مرکزِ گفتگو بناتے ہوئے یہ جائزہ لیں کہ اطلاقی سطح پر یہ اصول کہاں تک مسلم معاشروں میں پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ مغربی معاشرے میں عورت کا استحصال، اس کی عصمت و عفت پر حملے، اس کے حقوق کی پامالی کی داستان ایک اذیت ناک کہانی ہے لیکن مسئلہ کا حل محض یہ کہہ کر نہیں ہوسکتا کہ مغرب خواتین کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔ ہمیں خود اپنے معاشروں میں ہونے والے مظالم کو ختم کرنا ہوگا جن کی بنیاد وہ جاگیر دارانہ ذہن ہے، جس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ کوئی فرد جاگیردار ہی ہو، یہ ایک ذہنیت ہے جو ایک مزدور میں بھی اتنی ہی شدت سے پائی جاسکتی ہے جتنی ایک لاکھوں ایکڑ کے مالک وڈیرے یا سردار میں پائی جاتی ہے۔

ہمارے معاشرہ میں دین سے ناواقفیت اور دین کے نام پر دوانتہاؤں کا پایا جانا بھی ایک بڑا

مسئلہ ہے کہ ایک جانب ایسی شدت پیدا کرتی ہے کہ ایک خاتون اپنے گھر میں اجنبی اور ایک کمرے میں مقید ہو کر رہ جائے اور وہ صرف شوہر اور حقیقی اولاد کے ساتھ تو بات چیت کر سکے بلا تکلف کھانے میں شریک ہو سکے لیکن ان کے علاوہ اقربا اور رشتہ داروں سے مکمل قطع رحمی پر مجبور کر دی جائے اور دوسری طرف وہ انتہا بھی ہے کہ حجاب کو محض نگاہ تک محدود کر دیا جائے اور جسم کی عریانی کو معاشرتی ضرورت قرار دے دیا جائے۔ ہمیں ان دونوں انتہاؤں سے نکلنا ہوگا اور مدینہ منورہ کے معاشرے میں صحابیات رضوان اللہ علیہن کے طرزِ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی اور اجتماعی اخلاقیات کے اصولوں کی روشنی میں ایک نیا معاشرہ تعمیر کرنا ہوگا۔ وہ معاشرہ جو قرآن و سنت کے بنیادی اصولوں شرم و حیاء، عفت و عصمت، پاکبازی اور تقویٰ کو عملی زندگی میں ڈھال کر پیش کر سکے۔

اس سلسلہ میں تعلیمی حکمتِ عملی، معاشرتی رسوم و رواج کی تبدیلی، اور سب سے بڑھ کر افراط و تفریط والے ذہن کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پوری دیانت اور نفس کے تجزیہ و احتساب کے ساتھ اپنے معاملات کو شریعت کے دائرہ میں لانا ہوگا۔

شریعت کا دائرہ نہ قید و بند پر مبنی ہے نہ مادر پدر آزادی پر۔ یہ وہ حدود ہیں جو معروف پر مبنی ہیں۔ یہ معروف وہ ہے جو خالق کائنات نے خود متعین کیا ہے، یہ معاشرتی تبدیلی و ارتقاء کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا۔ یہ قرآن و سنت کی طرح سے آفاقیت اور عالمگیریت کا حامل ہے۔ اگر گفتگو معروف ہو، اگر معاشرت معروف ہو، اگر مہر معروف ہو، اگر رخصتی بھی معروف ہو، اگر معیشت معروف ہو تو پھر عدل کا قائم ہونا ایک منطقی عمل ہے۔

اس قیامِ عدل کے لیے راستہ صرف ایک ہے قرآن و سنت سے براہِ راست تعلق، اس کی تعلیمات و احکامات کا کسی حیل و حجت کے بغیر اور مغرب و مشرق کی فکری غلامی سے آزادی کے ساتھ اس کا نفاذ۔

اسلامی شریعت کی بنیاد نہ جنس کی تفریق ہے نہ رنگ و نسل اور زبان کی تفریق۔ یہ آفاقی اور عالمی حیثیت کے اصولوں پر مبنی وہ شریعت ہے جو قیامت تک کے لیے اصولِ حکمرانی فراہم کرتی

ہے اور وعدہ کرتی ہے کہ کسی متنفس کے ساتھ ذرہ برابر بھی ظلم روانہیں رکھا جائے گا۔ یہ تمام انسانوں کے لیے یکساں حقوق کی علمبردار اوران کے عملی نفاذ کی مثال پیش کرتی ہے۔ یہ انسان کو وقار، عزت، اکرام اور معاشرتی وجود سے نوازتی ہے یہ محض مسلم معاشرہ میں نہیں بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی اس پرعمل کیا جائے گا ایک صحت مند معاشرہ کو وجود میں لائے گی۔ یہی سبب ہے کہ یورپ وامریکہ کے وہ بے شمار متلاشیانِ حق جو اپنے معاشروں کے ظلم واستحصال سے بیزار ہیں یہ جاننے کے باوجود کہ یہ زرین اصولِ شریعت بہت سے مسلم ممالک میں بھی ابھی تک اجنبی ہیں اور مسلم ممالک کے غلام ذہن رکھنے والے فرمانرواان اصولوں کے مفید اور قابل عمل ہونے کا شعور نہیں رکھتے، یہ متلاشی حق بادِمخالف کے باوجود اسلام کے حق کو اسلام کی سچائی کو، اسلام کے اس دور میں قابلِ عمل ہونے کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ کامیابی اسلام کی کامیابی ہے اس میں مسلمانوں کی اپنی معاشرتی مثال کا کوئی دخل نہیں۔ اگر مسلمانوں کے معاشرے میں بھی اسلام کو وہ مقام حاصل ہو جائے جو ان متلاشیانِ حق کے دلوں میں اسلام کو حاصل ہے تو پھر پوری انسانیت کو اس عدل کو دیکھنے کا موقع مل سکتا ہے جو قیامت تک کے لیے صرف اور صرف حق وصداقت ہے اور انسانیت کو معراج پر لے جانے کا واحد راستہ ہے۔

— O —

''مغرب اور اسلام'' کا یہ خصوصی شمارہ علمی مکالمے کے اُس خاص موضوع کا احاطہ کرتا ہے جو اس وقت مغربی دنیا اور مسلم دنیا میں یکساں دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے یعنی مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں عورت کی حیثیت اور مغربی عورت کی اسلام کی طرف رغبت کے مظاہر کا جائزہ۔ اس موضوع پر جناب ثروت جمال اصمعی کا حاصلِ تحقیق یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

باب اوّل

بنیادی سوالات

مغربی خواتین میں اسلام کی مقبولیت - چند قابل غور پہلو

مغرب کے حکمرانوں، پالیسی سازوں، اُن کے ہم نوا دانشوروں اور ذرائع ابلاغ کی جانب سے اسلام کو دہشت گردی کا علم بردار اور عورتوں کے حقوق کی پامالی کا ذمہ دار قرار دیے جانے کے زبردست پروپیگنڈے اور عورتوں کے لیے حجاب کی اسلامی تعلیم کے خلاف جارحانہ مہم جوئی کے باوجود -- جس میں نائن الیون واقعات کے بعد موجودہ صدی کے پہلے عشرے میں غیر معمولی شدت رہی -- امریکہ اور برطانیہ سمیت بیشتر مغربی ملکوں میں قبول اسلام کے واقعات کی حیرت انگیز رفتار اور اس میں عورتوں کے تناسب کا مردوں کی نسبت کہیں زیادہ ہونا، اپنے اندر سوچ بچار کا بڑا سامان رکھتا ہے۔

طالبان کی قید میں رہ کر اسلام سے متاثر ہونے والی برطانوی صحافی یوآن رِڈلے (Yuonne Ridley) اور افغانستان اور عراق پر حملے میں امریکہ کے سب سے بڑے اتحادی سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر کی خواہر نسبتی لارن بوتھ (Lauren Booth) جیسی نمایاں شخصیات سمیت ہزاروں مغربی عورتیں دس سال کے اسی عرصے میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئی ہیں۔ مختلف مغربی ملکوں میں اسلام قبول کرنے والے افراد میں، بعض رپورٹوں کے مطابق عورتوں کا تناسب مردوں سے چار گنا تک ہے حالانکہ ایک طرف عموماً مسلمان معاشروں کے اسلام سے دور ہونے کے سبب اُن میں ایسے رسوم و رواج اور طور طریقے عام ہیں جو عورتوں کے ساتھ ظلم اور بے انصافی پر مبنی ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقوں میں باور کیا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب نے عورتوں کو آزادی اور مساوات کی نعمتوں سے ہم کنار کیا ہے جبکہ اسلامی تعلیمات اُس پر ناروا پابندیاں عائد کرتی، اُس کے استحصال کا سبب بنتی اور یوں مسلمان معاشروں کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوتی

ہیں لہٰذا اُن کی جانب سے مسلمان خواتین کو اُس مقام کے حصول کے لیے جدوجہد کی ہر ممکن ترغیب دی جاتی ہے جہاں مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے تقاضوں کے تحت چلنے والی آزادی نسواں کی تحریک نے مغرب کی عورت کو پہنچا دیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مغرب میں انتہائی بااثر قوتوں کی جانب سے اہل مغرب خصوصاً مغربی عورتوں کو اسلام سے متنفر کرنے کی منظّم کوششیں عروج پر ہیں۔ اس کے باوجود مغربی ملکوں میں قبول اسلام کے سلسلے کا حیرت انگیز رفتار سے جاری رہنا جس میں عورتیں مردوں سے کہیں آگے ہیں، یقیناً مغربی دنیا اور عالم اسلام دونوں کے اہل فکر ونظر کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اس بارے میں وقتاً فوقتاً چونکا دینے والی رپورٹیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ مثلاً چار جنوری ۲۰۱۱ء کو برطانوی روزنامہ انڈی پنڈنٹ میں ''برطانیہ کی اسلامی صورت گری: غیر معمولی تعداد کا قبول اسلام'' The Islamification of Britain: record numbers embrace Muslim faith کے عنوان سے شائع ہونے والی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ ''پچھلے دس سال میں برطانیہ میں مسلمان ہونے والے انگریزوں کی تعداد تقریباً دگنی ہوگئی ہے۔'' رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ ''اس کے باوجود کہ اسلام کو اکثر منفی انداز میں پیش کیا جاتا ہے، ہزاروں برطانوی ہر سال اسلام قبول کررہے ہیں۔'' رپورٹ میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ مشرف بہ اسلام ہونے والوں میں بھاری اکثریت عورتوں کی ہے۔

نائن الیون کے تقریباً ڈھائی سال بعد بائیس فروری ۲۰۰۴ء کو سنڈے ٹائمز نے ''اسلامی برطانیہ ممتاز افراد کو متاثر کررہا ہے'' (Islamic Britain lures top people) کے عنوان سے شائع ہونے والی اپنی ایک رپورٹ میں بتایا کہ ''مغربی اقدار سے غیر مطمئن اور مایوس ہونے کے بعد چودہ ہزار گورے برطانویوں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور برطانیہ کے کئی چوٹی کے لینڈ لارڈز، سیلی بریٹیز اور حکومت کی ممتاز شخصیتوں کی اولادیں مسلم عقیدے کے سخت اصول اپنا چکی ہیں۔''

برطانیہ ہی کی طرح امریکہ میں بھی قبول اسلام کا رجحان حیرت انگیز ہے اور تین امریکی اسکالروں کی ایک مشترکہ تحقیقی تصنیف میں انکشاف کیا گیا ہے کہ مشرف بہ اسلام ہونے والوں

میں عورتوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے جبکہ نائن الیون کے بعد ہر سال اوسطاً بیس ہزار امریکی مسلمان ہو رہے ہیں۔قبول اسلام کے رجحان میں یہ نمایاں اضافہ نائن الیون واقعات کے فوراً بعد رونما ہوا، جب اسلام کے بارے میں عمومی دلچسپی بڑھی۔یہ عین اس وقت ہوا جب اس کے بالکل متضاد صورت حال زیادہ متوقع تھی۔ان محققین کے مطابق، امریکیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد اسلام قبول کر رہی ہے، جن میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب تقریباً ایک نسبت چار کا ہے[1]۔

کئی مغربی ملکوں میں مسجد کے میناروں اور مسلمان عورتوں کے حجاب ونقاب تک پر پابندی عائد کر دیے جانے، متعدد مغربی پارلیمانوں میں اس مقصد کے لیے قانون سازی کا عمل جاری ہونے اور اس زبردست پروپیگنڈے کے باوجود کہ اسلام عورتوں کو مردوں کا تابع مہمل بناتا اور ان کے حقوق کو پامال کرتا ہے، مغرب کی عورتیں اسلام کی جانب کیوں مائل ہو رہی ہیں؟ یہ سوال یقیناً قابل غور ہے۔

یہ صورت حال اس بناء پر اور بھی حیرت انگیز ہو جاتی ہے کہ خود مسلمان معاشروں کی اسلام سے دوری اور مقامی کلچر اور روایات کے اپنا لیے جانے کی وجہ سے ان کے اندر جہیز کے جھگڑوں، غیرت کے نام پر قتل، کاروکاری، وٹہ سٹہ، عورتوں کو وراثت سے محروم رکھنے، جائیداد کو خاندان سے باہر جانے سے روکنے کے لیے بیٹیوں کی شادی نہ کرنے بلکہ اس مقصد کے لیے قرآن سے شادی جیسے ڈھکوسلوں کے ایجاد کر لیے جانے، سسرالوں میں بہوؤں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کے عام ہونے، اور شوہروں کی جانب سے بیویوں کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ اور ذہنی و جسمانی تشدد کے روا رکھے جانے جیسے معاملات رواج پا گئے ہیں اور یوں یہاں بھی عورتیں بہت بڑی تعداد میں بے انصافی کا شکار ہیں۔سوچنے کی بات ہے کہ اس کے باوجود مغربی عورتوں میں اسلام کی مقبولیت مسلسل کیوں بڑھ رہی ہے؟

مشرف بہ اسلام ہونے والی مغربی خواتین کے بقول -- جن میں سے چند کے بیانات اس

کتاب میں مشتے نمونہ از خروارے شامل کیے گئے ہیں-- اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے اصل ماخذوں یعنی قرآن وسنت کی روشنی میں اسلام کو اور اسلام میں عورت کے مقام ومرتبے کو براہ راست سمجھ کر مسلمان ہوئی ہیں جبکہ مسلمان معاشروں کی خرابیوں کے بارے میں وہ یہ شعور رکھتی ہیں کہ وہ اسلام پر عمل کرنے کا نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔

اس تناظر میں اس موضوع پر سنجیدہ غور وفکر کہ -- مغربی عورتیں اسلام کو اس کے کن اوصاف کی بناء پر اپنا رہی ہیں اور مغربی تہذیب نے انہیں جو مقام دیا ہے ان کے اندر اس سے بیزاری کیوں بڑھ رہی ہے -- یہ طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سوال پر بھی غور کیا جائے کہ اسلام اور مغربی تہذیب میں سے فی الحقیقت کون کرۂ ارض کی تقریباً نصف آبادی کے حقوق کا بہتر محافظ اور اس کے لیے باوقار زندگی کا ضامن ہے۔

مغرب کے ارباب حل وعقد اور پالیسی ساز اس صورت حال پر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کریں تو انہیں اپنے طرز حیات کے ان نقائص اور اسلام کے اُن اوصاف کا ادراک ہوسکتا ہے جو اہل مغرب کو اپنی تہذیب اور نظام زندگی سے غیر مطمئن اور اسلام کی جانب مائل کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ اِن خامیوں کے ازالے کی تدابیر بھی سوچ سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اسلام کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ کرنے پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ جبکہ اس صورت حال کا جائزہ مسلمانوں کو مغرب کی اندھی تقلید سے بچانے، ان کے اندر اسلام کی نعمت عظمیٰ کی قدر وقیمت کا حقیقی احساس اُجاگر کرنے اور غیر مسلم دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے حوالے سے بحیثیت خیر امت اپنے فرض منصبی کا شعور پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔

اہل مغرب کے قبول اسلام کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ بھی تو دیکھا جانا چاہیے کہ عیسائیت قبول کرنے اور مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جانے والے مسلمان کتنی بڑی تعداد میں دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

بلا شبہ یہ درست ہے کہ عیسائی مشنریوں کے کام کے نتیجے میں دنیا کے مختلف حصوں

میں مسلمانوں نے بڑی تعداد میں عیسائیت قبول کی ہے، لیکن شاید ہی کہیں اس کا سبب اسلام کے مقابلے میں موجودہ عیسائیت کی تعلیمات کو زیادہ معقول اور منطقی باور کرنا ہو۔ عیسائی مشنریوں نے عام طور پر دنیا کے مختلف علاقوں میں قدرتی آفات اور دیگر اسباب سے شدید غربت اور افلاس میں مبتلا مسلمانوں کو عیسائیت قبول کرنے کی صورت میں روزگار اور دوسرے مفادات کی ترغیب دے کر اسلام ترک کرنے پر آمادہ کیا ہے، جبکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی جانب سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جانا اس لیے کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں کیونکہ مغربی تہذیب دنیاوی اعتبار سے وقت کی غالب تہذیب ہے، سائنس و ٹیکنالوجی اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں اس کی بے پناہ ترقی نے ذہنوں پر اس کا رعب و دبدبہ طاری کر رکھا ہے اور اسے اپنا کر بہت سی دنیاوی آسائشیں اور مفادات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

حیرت انگیز اور انتہائی قابل غور بات تو یہ ہے کہ ایسی عالمی صورت حال میں جب دنیا میں مسلمان عددی طور پر ڈیڑھ ارب سے زیادہ ہونے کے باوجود عالمی سطح پر صدیوں سے بالکل بے وقعت اور بے وزن ہیں، مغربی طاقتوں نے انہیں دنیا کے مختلف حصوں میں کھلی جارحیت کا نشانہ بنا رکھا ہے، ان کی قیادتیں بالعموم مغربی طاقتوں کی آلہ کار اور کاسہ لیس ہیں، دنیا کے بیشتر حصوں میں مسلمان انتہائی پسماندگی کا شکار ہیں، اس کے باوجود ان کا دین مغرب کی انتہائی ترقی یافتہ اور طاقتور اقوام کے مرد و زن میں تعجب خیز حد تک مقبول ہو رہا ہے تو اس کے اصل اسباب کیا ہیں؟ اسلام اپنے کن خصائص کی بناء پر مسلمانوں کی تمام تر پستی اور پسماندگی کے باوجود اہل مغرب کے دل جیت رہا ہے؟ اور یہ کہ کیا اسلام انسانیت کے اتحاد و یکجہتی اور پوری انسانی دنیا کی اجتماعی ترقی اور خوش حالی میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہو سکتا ہے تو کس طرح؟

ہم آئندہ صفحات میں ان موضوعات پر بات کریں گے مگر اس سے پہلے مغرب میں اسلام کے خلاف جاری مہم کا، جو ''اسلاموفوبیا'' کے نام سے معروف ہے، ایک اجمالی جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ قارئین کو قبول اسلام کے اس عمل کے درست تناظر کا اندازہ ہو سکے۔

1- Yvonne Yazbeck Haddad, Jane I. Smith, Kathleen M.Moore, *Muslim Women in America: The Challenge of Islamic Identity Today*, New york, Oxford University Press, 2006, p 42.

باب دوم

''اسلاموفوبیا''

مغرب میں اسلام کے خلاف نفرت انگیزی کی مہم

مغرب میں اسلام کے خلاف تعصب کوئی نئی بات نہیں، مستشرقین کی تحریروں کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کی گمراہ کن تصویر کشی کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ صلیبی جنگوں میں اسلام کے ہاتھوں عالم عیسائیت کی شکست کا بدلہ، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز پروپیگنڈہ کرکے لیا جاتا رہا ہے۔ تاہم ماضی قریب میں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد جب عالمی سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مابین سرد جنگ ختم ہوگئی تو فلاسفہ مغرب نے تہذیبوں کے تصادم کا فلسفہ تخلیق کرکے اور اسلام کو مغربی تہذیب کے لیے اصل خطرہ قرار دے کر، جمہوریت کے لبادے میں ملبوس مغرب کی استعماری طاقتوں کے لیے اسلامی ملکوں کے وسائل پر تسلط کی خاطر عالم اسلام کے خلاف جارحیت کی راہ ہموار کرنے کی کوشش شروع کردی۔ اور مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے سرغنہ امریکہ کے حکمرانوں کی جانب سے بالآخر نائن الیون حملوں کا ڈرامہ رچا کر اس منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز کردیا گیا۔

نائن الیون واقعات کے خود ساختہ ہونے کے ناقابل تردید ثبوت وشواہد ریکارڈ پر موجود ہیں اور انہیں منظر عام پر لانے کا کام خود متعدد مغربی سائنسدانوں اور تحقیق کاروں نے انجام دیا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک پروفیسر ڈیوڈ رے گریفن (David Ray Griffin) ہیں، انہوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی کتاب Debunking 9/11 Debunking: An Answer to Popular Mechanics and Other Defenders of the Official Conspiracy Theory میں-- جسے اولیو برانچ پریس نے شائع کیا ہے-- ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آنے والی نائن

الیون کمیشن رپورٹ کا مکمل پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے اور اس کا ناقابل اعتبار ہونا حقائق اور واقعات کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نظرثانی شدہ اور اپ ڈیٹ کیا ہوا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ نائن الیون ٹرتھ موومنٹ، جس میں امریکہ کے ہزاروں سائنسداں، مختلف شعبوں کے ماہرین اور ممتاز افراد شامل ہیں، کی ویب سائٹ نائن الیون ٹرتھ ڈاٹ آرگ (www.911truth.org) پر بھی اس بارے میں نہایت چشم کشا مواد دستیاب ہے۔ جبکہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام راقم الحروف کی شائع کردہ کتاب ''دہشت گردی اور مسلمان: عالم اسلام کا مقدمہ عالمی ضمیر کی عدالت میں'' بھی نائن الیون واقعات اور دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی پوری مہم کے جعلی ہونے کے حوالے سے، جس کا مقصد مسلم دنیا کے وسائل ہتھیانے کا بہانہ تراشنا تھا، اہم ثبوت وشواہد پر مبنی ہے۔

نائن الیون کے بعد — جس کے بارے میں آج بھی متعدد سوالات کے جوابات تشنہ ہیں — اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کی زبردست مہم مغربی پالیسی سازوں کی ایک منطقی اور لازمی ضرورت تھی چنانچہ اس کا بھرپور اہتمام کیا گیا۔ امریکہ اور یورپ کے مختلف ملکوں میں اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کی جو مہم نائن الیون واقعات کے بعد سے خاص طور پر شروع کی گئی ہے، اس کا کچھ اندازہ معتبر مغربی ذرائع کی رپورٹوں سے لگایا جاسکتا ہے جو وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ ذیل میں اس حوالے سے کچھ اہم تفصیلات پیش کی جارہی ہیں۔

امریکہ میں اسلام مخالف مہم

امریکہ کے ایک تحقیقی ادارے سنٹر فار امریکن پروگریس کی جانب سے ۲۶ اگست ۲۰۱۱ء کو امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوششوں کے جائزے پر مشتمل ایک رپورٹ Fear, Inc. The Roots of the Islamophobia Network in America کے عنوان سے جاری کی گئی۔ اس میں مستند معلومات کی بنیاد پر انکشاف کیا گیا ہے کہ امریکہ میں لکھنے والوں اور اس حوالے سے

متحرک ایک گروپ نے پچھلے عشرے میں اسلام کے حوالے سے خوف کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے دسیوں لاکھ ڈالرخرچ کیے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ سات رفاہی گروپوں کی جانب سے تقریباً ۴۳ملین ڈالرمسلم مخالف مہمات چلانے کے لیے فراہم کیے گئے۔ ان میں ججوں کو امریکی عدالتوں میں اسلامی قوانین کوملحوظ رکھنے سے روکنے کے لیے قوانین کا تجویز کیا جانا، گراؤنڈ زیرو کے قریب اسلامی مرکز کی تعمیر کی مخالفت اور، سیاست اور دیگر شعبوں میں عمومی طور پر مسلم مخالف پروپیگنڈے کو ہوا دینے کی حوصلہ افزائی وغیرہ جیسی مہمات شامل تھیں۔ ۱۳۰صفحات پر مشتمل اس رپورٹ کے مرتبین میں دو مسلمان وجاہت علی اور فیض شاکر اور چار غیر مسلم EliClifton,MatthewDuss, Lee Fang, Scott Keyes شامل ہیں۔ رپورٹ کا آغاز ۲۲ جولائی ۲۰۱۱ء کو ناروے میں ہونے والی دہشت گردی کی مشہور واردات سے کیا گیا ہے جس میں فوری طور پر مسلمانوں کے ملوث ہونے کے شبہات امریکی میڈیا اور ماہرین کی جانب سے ظاہر کیے گئے تھے لیکن مجرم کے اپنے اعترافات سے ثابت ہوگیا کہ یہ ایک اسلام دشمن متعصب عیسائی کی کارروائی تھی۔

شکاگو تھیالوجیکل سیمینری کی پروفیسر Susan Brooks Thistlethwaite نے اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے ۳۰ اگست ۲۰۱۱ء کو واشنگٹن پوسٹ میں ایک مضمون ''اسلام کا خوف: ایک مطالعہ'' (Fear of Islam: a study) کے عنوان سے تحریر کیا۔ پروفیسر سوسن لکھتی ہیں:

''سنٹر فار امریکن پروگریس نے حال ہی میں ایک مفصل رپورٹ Fear, Inc.: The Roots of the Islamophobia Network in America, جاری کی ہے جس میں اُن عطیہ دہندگان، تنظیموں اور افراد کا ذکر ہے جنھوں نے اِس ملک میں اسلاموفوبیا کے فروغ کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے میں حصہ لیا ہے۔ جیسا کہ مالیات کی فراہمی کے گوشوارے سے واضح ہے، اس نیٹ ورک نے دسیوں لاکھ ڈالروں کی اس رقم سے اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے شدید خوف اور نفرت وعناد پھیلانے کا کام کیا اور یہی وہ چیز ہے جسے اسلاموفوبیا کہا جاتا ہے۔''

پروفیسر سوسن اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کی ان سرگرمیوں کی مذمت اور انہیں خود

امریکی معاشرے کے لیے تباہ کن قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''خوف کے فروغ کا یہ کاروبار خود اس ملک کے سیاسی ماحول کے لیے واضح طور پر خطرناک ہے۔ یہ نکتہ دائیں بازو کے نارویجین انتہا پسند اینڈرس بریوک (Anders Breivik) کے غیظ و غضب کے خوں ریز مظاہرے سے انتہائی المناک طور پر عیاں ہے جس کے نام نہاد منشور میں امریکہ میں بھاری مالی اعانتوں کے حامل اسلاموفوبیا کے اُن سرپرستوں کا حوالہ موجود ہے جن کا ذکر اس رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کا بریوک نے درجنوں بار حوالہ دیا ہے۔ سنٹر فار امریکن پروگریس کی رپورٹ میں سی آئی اے کے سابق افسر اور مشیر برائے دہشت گردی مارک سیگمین (Marc Sageman) کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس نے تسلیم کیا ہے کہ: جس طرح مذہبی انتہا پسندی وہ جڑ ہے جس سے القاعدہ نے جنم لیا، اسی طرح گمراہ کن پروپیگنڈے کے اِن مسلم دشمن ماہرین کی تحریریں بھی وہ جڑیں ہیں جن سے بریوک ظہور میں آیا ہے۔''

پروفیسر سوسن سی آئی اے کے مذکورہ افسر کے حوالے سے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتاتی ہیں کہ سیگمین توثیق کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف یہ شور وغوغا ''کاسٹ فری'' (مفت) نہیں ہے یعنی اس سلسلے میں سرگرم لوگ یہ کام مالی مفادات کے حصول کے لیے کر رہے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس سازشی تحریک کے جو نتائج مرتب ہوئے ان کا ذکر کرتے ہوئے ہارورڈ یونیورسٹی اور جان ہاپکنز یونیورسٹی کے ''اسلام اِن دی ویسٹ'' نامی پروگرام کی ڈائرکٹر Jocelyne Cesari نے سی این این کی ویب سائٹ پر ۲۴ اگست ۲۰۱۰ء کو اپنے خیالات کا اظہار ''اسلام ایک مذہب ہے، دہشت گردی کا نظریہ نہیں'' (Islam is a religion, not a terror ideology) کے عنوان سے ان الفاظ میں کیا:

''گراؤنڈ زیرو کے قریب اسلامی مرکز اور مسجد کی تعمیر کے منصوبے کے مخالف کہتے ہیں کہ یہ اس مقدس زمین کی بے حرمتی کے مترادف ہوگا۔ لیکن شکوک و شبہات بڑھانے والی چیز اُن مقامات پر مساجد کی تعمیر کی مخالفت ہے جو گراؤنڈ زیرو سے کم مقدس ہیں مثلاً مرفریزبورو

(Murfreesboro)، ٹینیسی (Tennessee)، شیبوائیگن (Sheboygan)، وسکنسن (Wisconsin)، ٹیمیکو لا (Temecula) اور کیلیفورنیا (California) وغیرہ۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسجدوں کی مخالفت کا سبب محض دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی یادنہیں بلکہ اسلام کے حوالے سے بڑھتی ہوئی عدم برداشت ہے جوسلامتی کے لیےمحسوس کیے جانے والے خدشات کا نتیجہ ہے۔''

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید کہتی ہیں:

''امریکہ میں مسجدوں اوراسلامی مراکز کی مخالفت، اُن اسلام مخالف تحریکوں سے گہری مماثلتیں رکھتی ہے جو جرمنی، بلجیم اور نیدرلینڈ میں جاری ہیں، جہاں لوگوں نے نئی مسجدوں پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔دسمبر ۲۰۱۰ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہریوں نے ایک ریفرنڈم میں نئے میناروں کی تعمیر ممنوع قرار دیے جانے کے حق میں ووٹ دیا۔''وہ مزید کہتی ہیں''ایک اور خصوصیت جو اٹلانٹک کے دونوں جانب جاری اسلام مخالف تحریکوں میں پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ وہ اپنی مخالفت کو جائز ثابت کرنے کے لیے دلیل دیتے ہیں کہ اسلام کوئی مذہب نہیں ہے۔مثال کے طور پر، ہالینڈ کے حالیہ انتخابات میں انتہائی دائیں بازو کے پارلیمنٹرین گیرٹ ولڈرز نے متواتر یہ استدلال کیا کہ اسلام ایک سیاسی نظریہ ہے۔ٹینیسی کے لیفٹننٹ گورنررون رمزے نے اپنی ناکام ہوجانے والی سفارش میں تجویز کیا تھا کہ پہلی آئینی ترمیم مذہب کی جس آزادی کا احاطہ کرتی ہے، اس کا اطلاق مسلمانوں پرنہیں کیا جاسکتا۔''[۱]

امریکہ میں اسلام کے خلاف منافرت کی تحریک کے موضوع پر پولیٹکس ڈیلی نامی امریکی جریدے کی امور خارجہ کی تجزیہ نگار سارا وائلڈ مین (Sarah Wildman) "Islamophobia Imported From Europe: An Ugly Trend Gets Uglier" (یورپ سے درآمد کردہ اسلامو فوبیا: ایک بدنما رجحان جومزید بدنما ہورہا ہے) کے زیرعنوان اپنے تجزیے میں لکھتی ہیں:

''کئی سال تک یورپ میں مسلمانوں کے خلاف پائے جانے والے جذبات، جومسجدوں کے میناروں اور سر کے رومال کے خلاف احتجاج کی شکل میں ظاہر ہورہے تھے،ایسی لہر تھے جو

ہمارے ساحلوں تک نہیں پہنچی تھی۔لیکن اب ہم ٹینیسی سے وسکنسن، کیلیفورنیا اور مین ہٹن تک خود اپنے ہیڈ اسکارف تنازعات اور مسجدوں پر پابندی کی مہمات رکھتے ہیں۔''

اس کے بعد سارا وائلڈ مین نے اپنی اس تحریر میں Joceylne Cesari کے محولہ بالا مضمون کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ''اسلام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے والے گروپ نہیں بلکہ سیاستداں، پنڈت، اور عام امریکی اب اسلام کو مغرب کے سیکولر معیارات کے لیے ایک حاضر و موجود خطرے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔''[۲]

یورپ میں اسلام مخالف مہم

نائن الیون کے بعد یورپ کے مختلف ملکوں میں، جیسا کہ سطور بالا میں ہم نے دیکھا، موجودہ اسلام مخالف مہم کا آغاز، جس کی ایک نمایاں خصوصیت مساجد اور حجاب پر پابندی کا مطالبہ ہے، امریکہ سے پہلے ہوا اور پھر اس میں بتدریج تیزی آتی چلی گئی، حتیٰ کہ کئی ملکوں میں مسلمان خواتین کے لیے حجاب ممنوع قرار دینے اور نئی مساجد کی تعمیر پر پابندی لگانے کے لیے پارلیمانوں میں باقاعدہ قانون سازی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حجاب کے حوالے سے فرانس اور بلجیم میں یہ قانون نافذ ہو چکا ہے جبکہ جرمنی، اسپین، آسٹریا، مختلف اسکینڈے نیوین ریاستوں اور کئی دوسرے ملکوں میں قانون سازی کے مراحل میں ہے۔

"Laws on Muslim veils and headscarves In Various Countries" کی سرخی کے ساتھ ایسوی ایٹڈ پریس آف امریکہ کی ۱۱اپریل ۲۰۰۱ء کو جاری کردہ ایک رپورٹ میں اس بارے میں ایک جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے۔[۳]

Europe's Islamophobia کے عنوان سے ممتاز امریکی تھنک ٹینک انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی اسٹڈیز کے شعبے فارن پالیسی اِن فوکس کی ۱۹اپریل ۲۰۱۰ء کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مختلف یورپی ملکوں میں اسلام مخالف مہم کے نتیجے میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جذبات میں بڑی تیزی سے شدت آرہی ہے۔ Jeanne Kay کی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''پچھلے سال جب سوئٹزر لینڈ کے لوگوں نے اپنی زمین پر مزید میناروں کی تعمیر پر پابندی کے حق میں ووٹ دیا تو پڑوسی ملکوں کے سیاسی مبصروں نے بڑی عجلت کے ساتھ اس رویے کو اخلاق کے منافی قرار دیتے ہوئے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ فرانس کے اخبار لبریشن (Liberation) نے اس خبر پر ''ووٹ آف شیم'' کی سرخی لگائی۔بلجیم کے لی سائر (Le Soir) نے میناروں کو نشانہ بنانے کا مقصد ان کے نیچے رہنے والی آبادی کو منافق بنانے اور گمراہ کرنے کی کوشش قرار دیا۔لندن ٹائمنر نے پیش گوئی کی کہ بین الاقوامی سطح پر اس اقدام کو سوئٹزرلینڈ کے لیے باعث شرم قرار دیا جائے گا۔ تاہم اس کے بعد آنے والے دنوں میں یورپی میڈیا کی توجہ داخلی محاذ کی جانب مبذول ہوئی اور ان کی طرف سے یہ ناگزیر سوال اٹھایا گیا کہ: کیا ہمارے ملک میں بھی ایسا ہونا چاہیے؟اخبارات نے غیر رسمی طور پر اپنے قارئین کی آراء جمع کیں اور کئی بڑے اخبارات کی ویب سائٹوں پر بھاری اکثریت کے ساتھ جو غیر مبہم نتیجہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ وہ سوئٹزرلینڈ کے اقدام کے حامی ہیں۔اسپین کے ایل پیز (El Pais) کی رائے شماری میں یہ تناسب ۸۰ فی صد اور جرمنی کے ڈائی ویلٹ (Die Welt) کے رائے عامہ کے جائزے میں ۷۹ فی صد رہا جبکہ فرانس کے پولنگ انسٹی ٹیوٹ IFOP نے بتایا کہ میناروں پر پابندی کے حامی اس اقدام کے مخالفین سے زیادہ نکلے۔''[۳]

جرمنی کے معروف تجزیہ کار اور محقق پال ہوکینوز (Paul Hockenos)،جن کی تحریریں نیوز ویک، نیویارک ٹائمنر، کرسچین سائنس مانیٹر اور متعدد دیگر بین الاقوامی اہمیت کے مغربی اخبارات و جرائد میں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں،''یورپ کا بڑھتا ہوا اسلاموفوبیا'' (Europe's Rising Islamophobia) کے عنوان سے ۲۴ اپریل ۲۰۱۱ء کو مڈل ایسٹ آن لائن پر جاری کیے گئے اپنے تجزیے میں عرب دنیا میں آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں اٹھنے والی عوامی تحریکوں کے باوجود مغرب میں اسلام کے خلاف خوف اور نفرت کی مہم کے جاری رہنے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عرب دنیا میں عوامی تحریک کے متاثر کن نظاروں کو دیکھ کر، جو مہینوں سے ٹیلی وژن اسکرینوں پر چھائے ہوئے ہیں، ایک شخص توقع کرسکتا ہے کہ جمہوری انقلاب کے یہ مناظر یورپ

کے اسلام مخالف عناصر یعنی ان سیاستدانوں اور دانشوروں کے بدنما مسلم دشمن پروپیگنڈے کے ڈھول میں کوئی چھید کرنے کا باعث بنے ہوں گے جو قسمیں کھاتے ہیں کہ اسلام اپنے بنیادی مزاج ہی میں ایک کلیت پسندانہ اور مطلق العنانیت پر مبنی نظام ہے۔ اور اگر تنہا یہ مناظر اسلام کے بارے میں ایک جامد اور پرتشدد مذہب ہونے کے فرسودہ خیالات کو ختم کرنے کا سبب نہ بن سکے ہوں تو رات کے پروگراموں میں نشر ہونے والی ایک سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے مصریوں، تیونسیوں اور دوسرے عرب ممالک کے لوگوں، یونیورسٹیوں کے طالب علموں، این جی اوز کی سربراہی کرنے والی عورتوں اور بچوں کی بات چیت اور آراء تو یقیناً یورپی مسلمانوں اور ان کے فرانسیسی اور جرمن ہم وطنوں کے درمیان باہمی اشتراک اور وابستگی کی شکل میں ظاہر ہوئی ہوں گی .....لیکن اس کے برعکس حالیہ انتخابات [۲۰۱۱ء کے انتخابات] میں فرانس میں دائیں بازو کے نیشنل فرنٹ اور فن لینڈ میں یورپی یونین کی مخالف ٹروفن جیسی اسلام مخالف پارٹیوں نے ہمیشہ سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ یہ اس بڑھتی ہوئی تحریک کی تازہ کامیابیاں ہیں جو مغربی یورپ کا سیاسی نقشہ از سرنو مرتب کررہی ہے۔ یہ عناصر بنیادی دھارے کے سیاستداں سمجھے جانے کا ہر جواز رکھتے ہیں۔صورت حال کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی امید پر انہوں نے انتہائی دائیں بازو کے لیے راستہ ہموار کردیا ہے۔مثال کے طور پر اپریل میں برقعے پر پابندی کا مضحکہ خیز فرانسیسی قانون لوگوں کی بھاری اکثریت کی حمایت سے زیر عمل آیا جبکہ یورپی یونین کے لیڈروں نے پناہ حاصل کرنے کے لیے تیونسی شہریوں کے اٹلی اور مالٹا پہنچنے پر خطرے کا بٹن دبا کر بحیرہ روم کے پورے خطے میں پرامن انقلابیوں کے امیج کو یورپ کے قلعے کو گھیر لینے والے غربت زدہ ہجوم میں بدل دیا۔''

اسی تحریر میں اسلام دشمنی میں اس شدت کے بنیادی اسباب کی وضاحت پال یوں کرتے ہیں:

''جو چیز مسلم دشمن نسل پرستی کو اس قدر ہلاکت خیز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ ماضی کی عوامیت (پاپولزم) کے برخلاف اسلاموفوبیا انتہائی بائیں سے انتہائی دائیں بازو تک بلا لحاظ طبقہ و تعلیمی سطح پورے سیاسی منظر پر وسیع اپیل رکھتا ہے۔ یہ فرانس، نیدرلینڈ، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ، آسٹریا اور اب

سویڈن اورفن لینڈ میں بھی، جہاں انتخابی سیاسی جماعتوں میں یہ اپنا اظہار کرتا ہے وہیں اس کے وکیل-- نامناسب یہود دشمنی اور ناقابل عمل توسیع پسندانہ تصورات کے علم بردار پرانے مکتب فکر کی انتہائی دائیں بازو کی جماعتوں کی نسبت-- اپنے موقف کی بہتر نمائندگی کرتے ہیں۔ تاہم اس عمل میں انتہائی دائیں بازو کی جماعتوں کا حصہ اس حوالے سے کئی گنا زیادہ ہے۔ وہ اپنے منشوروں میں بہت نمایاں طور پر اسلام دشمن سوچ کا اظہار کرتی ہیں اور اس معاملے میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس فکر کے نمائندے کبھی اتنی بڑی تعداد میں اتنے زیادہ مغربی یورپی ملکوں میں اقتدار کے لیوروں کے اتنے قریب نہیں تھے جتنے آج ہیں۔"[5]

مغرب میں اسلام کے خلاف نفرت انگیزی کی اس مہم کے کئی پہلو ہیں تاہم ان کی تفصیلات ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، ہمارا مقصد صرف اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ مغربی دنیا میں اسلام کے خلاف اس پرزور تحریک کے علی الرغم اوراس پروپیگنڈے کے باوجود کہ اسلامی معاشرے میں عورتوں کے حقوق بری طرح پامال کیے جاتے ہیں جبکہ مغربی تہذیب نے انہیں مردوں کے شانہ بشانہ لاکھڑا کیا ہے، آخر مغربی عورتوں میں قبول اسلام کے حیرت انگیز رجحان کے اسباب کیا ہیں۔ لہٰذا اگلے باب میں ہم یہ دیکھیں گے مغربی معاشرے میں فی الحقیقت عورت کا مقام کیا ہے اور وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بناء پر وہ اس مقام کو ٹھکرا کر اسلام کے سایۂ عاطفت میں پناہ حاصل کر رہی ہے۔

حواشی

1- http://articles.cnn.com/2010-08-24/opinion/cesari.islam.is.a.religion_1_islamic- centers-and-mosques-anti-islamic-mosque-projects?_s=PM:OPINION

2- http://www.politicsdaily.com/2010/08/28/importing-islamophobia-from-europe-an-ugly-trend-gets-uglier/

3- http://abcnews.go.com/International/wireStory?id=13348773#.T31jJvBDw40

4- http://www.fpif.org/articles/europes_islamophobia

5- http://www.middle-east-online.com/English/?id=45736

باب سوم

خاتون مغرب

مغربی تہذیب کے بنیادی مراکز کا خصوصی مطالعہ

جدید مغربی تہذیب کا مولد اور اولین پیشوا انگلستان یا برطانیہ ہے۔ امریکہ سپر پاور ہونے کے باوجود مغرب کی تہذیبی اقدار کی نمائندگی کے حوالے سے آج بھی برطانیہ کا ہم پلہ نہیں۔ اس لیے مغرب میں عورتوں کے ساتھ برتاؤ کے حوالے سے برطانیہ کا خصوصی مطالعہ نہایت اہم ہے۔ مساوات مرد وزن کا نعرہ برطانیہ ہی میں سب سے پہلے بلند ہوا لیکن آزادی نسواں کی تحریک کو تقریباً تین صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی خود برطانوی اہل فکر ونظر کے مطابق برطانیہ کی عورت مساوی حقوق اور باوقار مقام سے محروم ہے اور دفاتر اور کارگاہوں میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک معمول کا حصہ ہے۔ اس حوالے سے کچھ اہم حقائق اور معلومات اس باب میں پیش کی جارہی ہیں۔

تیس ہزار برطانوی عورتیں حمل کے باعث ہر سال روزگار سے محروم

مؤقر اور معروف برطانوی جریدے گارجین کی پانچ جون ۲۰۰۹ء کی ایک رپورٹ کے مطابق مساوات مرد وزن کی تحریک کے سرخیل اس ملک میں آج بھی ہر سال اوسطاً ۳۰،۰۰۰ عورتیں ملازمتوں سے فارغ کی جاتی ہیں۔ "Employers targeting pregnant women for redundancy" یعنی ''مالکان حاملہ عورتوں کو فاضل قرار دے کر نشانہ بنارہے ہیں'' کی سرخی کے تحت شائع کی جانے والی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''اپنی ملازمتوں سے محروم ہونے والی حاملہ عورتوں اور نئی ماؤں کی تعداد میں چونکا دینے والا اضافہ دیکھا جارہا ہے کیونکہ مالکان، بچے نہ رکھنے والے اُن کے دفتری ساتھیوں کے مقابلے میں انہیں غیر ضروری قرار دے کر ملازمتوں سے نکال دیتے ہیں۔ یہ معلومات اس ہفتے وجود میں آنے

والا مددگار گروپوں کا ایک اتحاد منظر عام پر لایا ہے۔حاملہ عورتوں کے ساتھ کارگاہوں میں امتیازی سلوک کے خلاف بننے والے اتحاد The Alliance Against Pregnancy Discrimination In the Workplace نے وکلاء اور امدادی اداروں سے مشاورت کرنے والی عورتوں کی تعداد میں تیز رفتار اضافہ دیکھا ہے کیونکہ زچگی کی چھٹیوں یا ایام حمل کے دوران ان کی نوکریاں ختم کی جاتی رہی ہیں۔ اتحاد نے گزشتہ روز متنبہ کیا کہ: 'اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مالکان سرد بازاری کو امتیازی سلوک کے انسدادی قانون کو توڑنے کا بہانہ بنا رہے ہیں...زچگی کی چھٹی کے نتیجے میں ملازمت سے محرومی کے طویل المیعاد اثرات عورتوں کے مالی تحفظ کو ان کی پوری زندگی کے لیے خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔

ایکولٹی (Equality) نامی تنظیم اور انسانی حقوق کے کمیشن کے مطابق اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال تقریباً تیس ہزار عورتیں حمل کی بناء پر اپنے روزگار سے محروم ہو جاتی ہیں، لیکن خدشہ ہے کہ معاشی انحطاط کی وجہ سے یہ تعداد اور بڑھے گی۔حکومت اس نوعیت کے امتیازی سلوک کے بارے میں کوئی معلومات اور اعداد وشمار جمع نہیں کر رہی ہے اور ٹریبونلز سروس کے لیے اس عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالنا فی الوقت محال ہے۔''[1]

مردوں کے مساوی تنخواہ کے لیے ۹۸ سال مزید انتظار

گارجین نے اپنی ۳۱ اگست ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں ایک خبر اس سرخی کے ساتھ شائع کی ہے کہ ''خواتین ایگزیکٹوز کو مساوی تنخواہوں کے لیے ۹۸ سال انتظار کرنا پڑ سکتا ہے''

"Women executives could wait 98 years for equal pay, says report" یہ خبر برطانیہ کے چارٹرڈ مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ کی ایک رپورٹ پر مبنی ہے۔اس کی ذیلی سرخی یہ ہے کہ ''انتظامی عہدوں پر کام کرنے والی عورتیں پہلے ہی مردوں سے دس ہزار پونڈ کم تنخواہ لے رہی ہیں''۔خبر کا آغاز یوں ہوتا ہے: ''عورتوں کو رائے دہی کا مساوی حق ۱۹۲۸ء سے حاصل ہے مگر تنخواہوں میں برابری کے لیے انہیں مزید ۹۸ سال انتظار کرنا پڑ سکتا ہے۔یہ بات ایک ریسرچ

کے نتیجے میں سامنے آئی ہے۔"

خبر میں مزید کہا گیا ہے کہ "خواتین ایگزیکٹوز کی تنخواہیں اگرچہ اپنے مرد ساتھیوں کی نسبت زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہیں لیکن اگر اضافے کی رفتار وہی رہی جواب ہے تو باہمی فرق ختم ہوتے ہوتے سن ۲۱۰۹ء آجائے گا، یہ انکشاف چارٹرڈ مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ نے کیا ہے۔ ریسرچ کی رو سے مرد منتظمین کو یکساں ذمہ داریوں کے لیے بدستور عورتوں سے زیادہ معاوضہ دیا جارہا ہے، عورتوں کی ۳۱۸۹۵ پاؤنڈ تنخواہ کے مقابلے میں مردوں کو اوسطاً ۴۲۴۴۱ پاؤنڈ دیے جارہے ہیں۔ ریسرچ کے مطابق پچھلے سال تنخواہوں میں جو فرق ۱۰,۰۳۱ پاؤنڈ تھا وہ بڑھ کر ۱۰,۵۴۶ پاؤنڈ ہو گیا ہے، باوجود یہ کہ فروری ۲۰۱۱ء تک بارہ مہینوں میں عورتوں کی تنخواہیں مردوں کی ۲ء۱ شرح کے مقابلے میں ۲ء۴ کی شرح سے بڑھیں۔"[۲]

بیس فی صد بڑی کمپنیوں کی انتظامیہ میں عورتوں کا حصہ صفر

گارجین کی ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۱ء کی ایک خبر کے مطابق برطانیہ کی بڑی کمپنیوں کے ڈائرکٹروں میں عورتوں کا حصہ ہولناک حد تک کم ہے۔

'Shocking' lack of women top company directors, says report کی سرخی کے تحت شائع ہونے والی اس خبر میں، جس کی بنیاد ڈیلائٹ نامی ادارے کی ایک ریسرچ ہے، کہا گیا ہے:

"برطانیہ کی سب سے بڑی کمپنیوں کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں عورتوں کا ہولناک حد تک کم تناسب جمعرات کو منظر عام پر آنے والے ایک تجزیے سے عیاں ہوا جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ بھرتیوں کی موجودہ شرح سے بورڈ رومز میں یہ فرق بیس سال میں تین ڈائرکٹروں میں سے ایک کے عورت ہونے تک پہنچے گا۔ ڈیلائٹ کی اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ FTSE 100 کی ۲۰ فی صد کمپنیوں کے بورڈوں میں کوئی خاتون ڈائرکٹر شامل نہیں ہے جبکہ اعلیٰ انتظامی عہدوں میں سے صرف پانچ فی صد پر عورتیں فائز ہیں۔ ڈیلائٹ کی ٹیم میں شامل کیرول ایرواسمتھ کے بقول ایسی کمپنیوں کی تعداد بلاشبہ ہولناک ہے جن کے بورڈز میں کوئی خاتون رکن نہیں۔ یہ بات خاص طور

پر باعث تشویش ہے کہ دس سال کے دوران بورڈز آف ڈائرکٹرز میں عورتوں کا تناسب ۵ سے بڑھ کر صرف ۹ فی صد تک پہنچا ہے۔ اس شرح سے بورڈز میں عورتوں کی نمائندگی کے ۳۰ فی صد تک پہنچنے میں مزید ۲۰ سال لگیں گے جو تھرٹی پرسنٹ کلب کا ہدف ہے۔''[۳]

برطانیہ کی سیکس انڈسٹری کو سالانہ چار ہزار عورتوں کی فراہمی

گارجین کی ۲۲ اگست ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں انکشاف کیا گیا ہے کہ برطانیہ میں ہر سال ناقابل یقین تعداد میں عورتیں عصمت فروشی کے کاروبار کے لیے مختلف ملکوں سے لائی جاتی ہیں۔ ''مارکیٹ فورسز'' کی سرخی والی اس خبر کی ذیلی سرخی کے الفاظ ہیں:

''بہت سے مرد جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے عورتوں کی خریداری کو محض شاپنگ کی ایک اور قسم سمجھتے ہیں، لیکن ان کا یہ طرز عمل اس کاروبار کے لیے عورتوں کی غیر قانونی تجارت اور درآمد (ٹریفکنگ) کو تیزی سے بڑھا رہا ہے''۔

رپورٹ میں کیا گیا یہ انکشاف مغربی تہذیب کے اس عظیم مرکز میں عورتوں کے مقام و مرتبے کی بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے کہ ''سرکاری اعداد وشمار سے یہ تخمینہ سامنے آتا ہے کہ برطانیہ میں ہر سال کوئی چار ہزار عورتیں سکڑتی ہوئی سرحدوں اور سیکس کی خریداری کے حوالے سے بدلتے ہوئے رویوں سے مہیا ہونے والی سہولتوں کی بناء پر فروغ پذیر سیکس انڈسٹری کی مانگ پوری کرنے کے لیے درآمد کی جاتی ہیں۔''

ان حقائق کو سامنے لانے کا سہرا CCAT نامی ادارے کے سر ہے جو کرائیڈن کمیونٹی اگینسٹ ٹریفکنگ کا مخفف ہے۔ کرائیڈن (Croydon) جنوبی لندن کا علاقہ ہے۔ یہاں وزارت داخلہ کے دفاتر واقع ہیں جن میں بارڈر اور امیگریشن ایجنسی بھی شامل ہیں لہٰذا اس علاقے میں یہ کاروبار زیادہ آسان ہے۔ نتیجہ یہ کہ گارجین کے الفاظ میں یہاں ''جنسی ہوس پوری کرنے کے لیے درآمد کی گئی عورتوں کی خریداری اتنی ہی سہل ہے جیسے پیزا کا آرڈر دینا''۔

خبر کے مطابق علاقے میں اس کاروبار کے تیزی سے پھلنے پھولنے کی وجہ سے مقامی لوگوں

نے پریشان ہوکر اپنے طور پر معاملات کی تحقیق کی کوشش کی تاہم انتقامی کارروائی کے خوف سے انہوں نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے سٹے بازوں کی حیثیت سے سوقحبہ خانوں، حماموں (Saunas)، اوراسکارٹ ایجنسیوں کو فون کیے جن کے اشتہارات مقامی اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔اور پھر یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ عصمت فروشی کے لیے بیچی جانے والی ۸۴ فی صد عورتیں بیرون ملک سے لائی گئی تھیں،اوران میں سے اکثر غیر قانونی طور پر خریدی اور بیچی گئی تھیں۔[۴]

مظلوم عورتوں کو ۲۰۱۱ء میں بھی قانونی تحفظ نہیں ملا

برطانیہ میں عورتوں کی یوں بے روک ٹوک تجارتی سطح پر درآمد اور انہیں عصمت فروشی پر مجبور کیے جانے کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور حکومت نے انسانی ٹریفکنگ کے خلاف ۲۰۱۱ میں قانون سازی بھی کی لیکن ماہرین کے بقول یہ قانون سازی برطانیہ میں جبری عصمت فروشی کے لیے عورتوں کی درآمد پر اثر انداز نہیں ہوگی بلکہ روزگار کے لیے برطانیہ کا رخ کرنے والے عام تارکین وطن کی آمد کو روکنے تک محدود رہے گی۔

گارجین کی ۲ جولائی ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں New trafficking laws 'will not care for slavery victims' کی سرخی کے تحت ہیومن ٹریفکنگ فاؤنڈیشن کے سربراہ اور ۲۰۱۰ء تک پارلیمنٹ کے رکن رہنے والے انتھونی اسٹین کا بیان عصمت فروشی پر مجبور کردی جانے والی درآمد شدہ عورتوں کے حوالے سے حقیقت واضح کرتا ہے۔انتھونی نے اس مسئلے کے حل کے لیے کل جماعتی پارلیمانی گروپ بھی بنایا تھا۔ تاہم اس ضمن میں بننے والے قانون پر ان کا کہنا تھا کہ یہ بات باعث افسوس ہے کہ انسانی تجارت کی روک تھام کے لیے تشکیل دی جانے والی حکمت عملی میں اصل زور بے بس عورتوں کے مسئلے کے بجائے سیاسی معاملات پر دیا گیا ہے۔ان کے بقول:

''حکومت کی جانب سے انسانی تجارت کے مسئلے کو ترجیح دینے کا دعویٰ حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا، انسانی ہمدردی کے نقطہ نظر سے اس قانون کو تارکین وطن کے بجائے انسانوں کی تجارت کرنے

والوں کے خلاف اوران کا نشانہ بننے والوں کے لیے ہمدردی پر مبنی ہونا چاہیے تھا۔''[5]

برطانیہ میں عورتوں پر گھروں میں تشدد

مغرب کی تہذیبی اقدار کے مثالی مرکز انگلستان میں عورتوں کے ساتھ گھروں میں ان کے شوہروں یا بوائے فرینڈز وغیرہ کی جانب سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے، اس بارے میں سرکاری اور دیگر معتبر ذرائع کے فراہم کردہ کچھ اہم اعداد و شمار ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں:[6]

- ۴۵ فی صد عورتیں کسی نہ کسی نوعیت کے گھریلو تشدد کے تجربے سے گزرتی ہیں، جنسی زیادتی یا خوف زدہ کیا جانا۔[7]
- تقریباً ۲۱ فی صد لڑکیاں بچپن میں کسی نہ کسی قسم کی جنسی زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔[8]
- ہر سال کم از کم ۸۰،۰۰۰ عورتیں زنا بالجبر کا نشانہ بنتی ہیں۔[9]
- ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ایک سروے کے مطابق سوال کا جواب دینے والے چار میں سے ایک شخص کا خیال تھا کہ زنا بالجبر کا نشانہ بننے والی عورت اس عمل کی جزوی یا کلی طور پر خود ذمہ دار ہے اگر اس نے جنسی خواہش کو بھڑکانے یا جسم کو نمایاں کرنے والا لباس پہن رکھا ہو اور ہر پانچ میں سے ایک شخص اسی نقطہ نظر کا حامی تھا اگر کوئی عورت متعدد افراد سے جنسی تعلق رکھتی ہو۔[10]
- انگلستان اور ویلز میں ہر ہفتے دو عورتیں اپنے کسی متشدد مرد دوست یا سابق دوست کے ہاتھوں قتل ہوجاتی ہیں۔ یوں گھروں میں ماری جانے والی تقریباً ۴۰ فی صد عورتیں اسی طرح قتل ہوتی ہیں۔[11]
- گھریلو تشدد کے ۷۰ فی صد واقعات کا نتیجہ زخمی ہونے کی شکل میں نکلتا ہے جبکہ جان پہچان والوں کے تشدد میں یہ تناسب ۵۰ فی صد، اجنبی لوگوں کے تشدد میں ۴۷ فی صد اور راہ زنی کے واقعات میں ۲۹ فی صد دیکھا گیا۔[12]
- جبری شادیوں کا ہدف بننے والوں میں ۸۵ فی صد عورتیں ہوتی ہیں۔[13]

- گھریلو تشدد پر، اس کا نشانہ بننے والوں کے ذاتی خرچ کے علاوہ علاج معالجے اور ریاست کے مجموعی اخراجات کا تخمینہ ۲۳ بلین پاؤنڈ سالانہ ہے۔[۱۴]

پالتو کتے پر تشدد قابل مذمت عورتوں پر نہیں

گھروں کے اندر عورتوں پر تشدد کو برطانوی معاشرے میں جس طرح قبول کرلیا گیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بی بی سی کی جانب سے ۱۸ فروری ۲۰۰۳ء کو پیٹر گلاوڈ کی Scale of domestic abuse uncovered یعنی ''گھریلو تشدد کا پیمانہ بے نقاب'' کے زیر عنوان پیش کردہ ایک سروے رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۷۸ فی صد مردوں اور عورتوں نے کہا کہ اگر ان کے پڑوس میں کوئی شخص اپنے پالتو کتے کو پیٹ رہا ہوگا تو وہ پولیس کو اطلاع دے کر اسے بچانے کی کوشش کریں گے جبکہ کسی گھر میں کسی مرد کی جانب سے اپنی بیوی یا دوست عورت پر تشدد کیے جانے کی صورت میں پولیس کو اطلاع دینے پر صرف ۵۳ فی صد نے آمادگی ظاہر کی۔[۱۵]

گھر، عورتوں کے لیے سب سے خطرناک جگہ

اس تکلیف دہ اور شرمناک صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز برطانوی دانشور اور تجزیہ کار Ian Sinclair ''عورتوں کے خلاف تشدد'' (Violence Against Women) کے زیر عنوان اپنے تجزیے میں کہتے ہیں:

''عورتوں کو درپیش خطرات کے حوالے سے ہمیں پورے معاملے پر ازسرنو سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ مین اسٹریم میڈیا اگرچہ مسلسل اجنبیوں کے خطرے کا غوغا برپا کیے ہوئے ہے مگر فی الحقیقت عورت کے لیے سب سے خطرناک جگہ اس کا اپنا گھر ہے۔ اکثر اسے آرام دہ اور محفوظ جنت تصور کیا جاتا ہے لیکن عملاً یہ ایسی جگہ ہے جہاں اُسے خوف، زخم اور بعض اوقات موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کہ برطانیہ میں ہر ہفتے دو عورتیں اپنے موجودہ یا سابقہ مرد آشناؤں کے ہاتھوں قتل ہوتی ہیں۔''[۱۶]

گھروں میں یہ سب کچھ کیوں کر ممکن ہوتا ہے؟

اس گتھی کو سلجھاتے ہوئے یونیورسٹی آف بریسٹول کے وائلنس اگینسٹ ویمن ریسرچ گروپ کی ڈائرکٹر گل ہیگ Gill Hague کہتی ہیں:

''گھر بہرصورت بند دروازوں کے پیچھے، عام لوگوں کی نگاہوں سے دور، پرائیویسی اور دوسرے لوگوں کے معاملات میں عدم مداخلت کے گفتہ و ناگفتہ قوانین کے فراہم کردہ تحفظ کا حامل ہے۔''[۱۷]

آبروریزی کے مجرموں کی سزایابی کی شرح میں مسلسل کمی

برطانوی وزارت داخلہ کی ایک رپورٹ کے مطابق جو گارجین کی ۲۱ جولائی ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں ''آبروریزی کے مجرموں کی سزایابی کی شرح میں اضافے کی کوششیں ناکام'' (Efforts fail to improve rape conviction rates) کے عنوان سے شائع ہوئی، بتایا گیا ہے کہ عورتوں کی آبروریزی کے مجرموں کی سزایابی کی شرح پست ترین سطح تک گرچکی ہے۔ Sandra Laville کی اس رپورٹ کے مطابق حکومت، پولیس اور پراسیکیوٹرز کی کوششوں کے باوجود اس شرح میں اضافہ نہیں ہورہا اور کئی سال سے یہی کیفیت ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء میں پولیس کو رپورٹ کیے جانے والی عصمت دری کی وارداتوں میں سے صرف چھ فی صد ملزمان کو سزا ہوئی جبکہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں یہ شرح ۳۲ فی صد تھی۔[۱۸]

آبروریزی کے مجرموں کی سزایابی کی اتنی کم شرح پر Rape: a history from 1860 to present نامی کتاب کی مصنفہ Joanna Bourke لکھتی ہیں: ''عصمت دری کے جن مجرموں کے مقدمات کا نتیجہ سزا کی شکل میں نکلے انہیں اپنے آپ کو استثنائی طور پر بدقسمت سمجھنا چاہیے۔''[۱۹]

اس کے ساتھ ساتھ جنسی جارحیت کا نشانہ بننے والی خواتین کی دیکھ بھال کے مراکز کی تعداد اور ان کے لیے مختص کی جانے والی رقم میں بھی مسلسل کمی ہورہی ہے۔ گارجین میں تین جولائی ۲۰۰۷ء کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق انگلستان اور ویلز میں ریپ کرائسز سنٹرز کی تعداد ۱۹۸۵ء میں ۸۴ تھی جو ۲۰۰۷ء میں گھٹ کر صرف ۳۲ رہ گئی اور ان میں سے بھی نصف کو قلت

وسائل کے سبب بندش کے خطرے کا سامنا تھا۔[20]

لندن میٹرو پولیٹن یونیورسٹی میں جنس زدہ تشدد کے مضمون کی پروفیسر Liz Kelly نشاندہی کرتی ہیں کہ اس عرصے میں پول ڈانسنگ کلبوں کی تعداد بڑھ کر تین گنا ہوگئی ہے جس سے برطانوی معاشرے کی موجودہ ترجیحات واضح ہیں۔

امریکہ میں خواتین سے سلوک

یکساں کام کی اُجرت مردوں سے ۲۳ فی صد کم

امریکہ کی نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن کی جانب سے ''امریکہ میں محنت کش عورتوں کے کام کے حالات یورپ کے مقابلے میں ابتر ہیں'' کے عنوان سے پیش کی گئی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق، جو فروری ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آئی جسے Riley Karbon اور Field Intern نے مرتب کیا ہے، امریکہ میں ایک ہی نوعیت کے جس کام کے لیے مرد کارکن کو ایک ڈالر دیا جاتا ہے، خاتون ورکر کے لیے اسی کام کی اجرت ۷۷ سینٹ ہے حالانکہ ورک فورس میں اب امریکہ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اور یہ حقیقت رپورٹ کے مطابق محکمہ محنت کے ان ہی دنوں جاری کردہ ڈیٹا سے واضح ہے۔[21]

چنانچہ نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن نے ۱۲ اپریل ۲۰۱۱ء کو عورتوں اور مردوں کی اجرتوں کے فرق کے خاتمے کا دن منایا۔ اس موقع پر تنظیم کی صدر ٹیری اونیل (Terry O'Neill) نے بیان دیتے ہوئے کہا:

''فی الوقت عورتوں کو مردوں کے ایک ڈالر کے مقابلے میں ۷۷ سینٹ ادا کیے جاتے ہیں۔ ذرا سوچیے، پورے سال کل وقتی ملازمتیں کرنے والی محنت کش خواتین کارکنان، دو دہائیوں سے مردوں کے مقابلے میں ۷۰ اور ۸۰ فی صد کے درمیان تنخواہوں پر رکی ہوئی ہیں۔ مساوی اجرت کا دن اس عدم مساوات کے خلاف ایک پرزور یاددہانی ہے۔ یہ دن اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ نئے سال میں متوسط درجے کی عورتوں کو وہ رقم حاصل کرنے کے لیے لازمی طور پر کتنا کام کرنا

ہوگا جو متوسط درجے کے مردوں کو پچھلے سال ادا کی جا چکی ہے۔اس امر پر بھی خصوصی توجہ دی جانی چاہیے کہ رنگ دار عورتوں کی تنخواہیں، نسلی امتیاز کی وجہ سے اوسط سے اور بھی پیچھے ہیں۔''[۲۲]

عورتوں پر تشدد: اقوام متحدہ کی نمائندہ خصوصی کی رپورٹ

امریکہ میں عورتوں پر تشدد کے ہمہ پہلو جائزے کے لیے ۲۴ جنوری سے ۷ فروری ۲۰۱۱ء تک اقوام متحدہ کی ہیومن رائٹس کونسل کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے پروفیسر راشدہ منجو نے امریکہ کا مطالعاتی دورہ کیا۔ اس سے پہلے ۲۰۰۹ء میں بھی وہ تین ماہ کے لیے اس تحقیقی مشن پر کام کر چکی تھیں۔ راشدہ منجو جنوبی افریقہ میں ہائی کورٹ کی وکیل ہیں اور امریکہ کی ویسٹر یونیورسٹی میں معلّمی کے فرائض بھی انجام دیتی رہی ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں انہوں نے ''عورتوں کے خلاف تشدد، اس کی وجوہات اور نتائج و اثرات'' کے عنوان سے یہ رپورٹ دس اکتوبر ۲۰۱۱ء کے اجلاس میں پیش کی جس کی خبر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ہائی کمشنر کے دفتر کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔[۲۳]

اس مفصل رپورٹ میں پیش کیے گئے کچھ اہم واقعاتی حقائق اور اعداد و شمار یہ ہیں:[۲۴]

شوہروں اور دوستوں کے ہاتھوں تشدد

گھریلو تشدد یعنی شوہروں یا مرد آشناؤں یا دوستوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہونے والے تشدد کے ضمن میں رپورٹ میں کہا گیا ہے ''گھریلو تشدد یا قریبی ساتھیوں کی جانب سے ہونے والا تشدد انسانی حقوق کی ایسی خلاف ورزی ہے جو امریکہ کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر جاری ہے۔نیشنل کرائم وِکٹی مائزیشن سروے کے مطابق ۲۰۰۸ء میں امریکہ میں عورتوں پر مرد ساتھیوں کی جانب سے تقریباً ۵،۵۲،۰۰۰ پُرتشدد جرائم کا ارتکاب کیا گیا۔ان میں ۳۵،۶۹۰ زنا بالجبر یا جنسی زیادتی کی وارداتیں، ۳۸،۸۲۰ ڈکیتیاں، ۷۰،۵۵۰ شدید طور پر زخمی کرنے والے حملے، اور ۴،۰۶،۵۳۰ نسبتاً کم جسمانی نقصان پہنچانے والے حملے شامل ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۸ء

میں اوسطاً ہر روز ۵۰۰ عورتیں جنسی حملوں کا نشانہ بنیں۔تشدد کے واقعات کی شرح عورتوں میں ۴٫۳ فی ہزار اور مردوں میں ۰٫۸ فی ہزار رہی۔(پیراگراف:۸)

۲۰۰۷ء میں قتل ہونے والی عورتوں میں سے ۶۴ فی صد اپنے قریبی مرد دوستوں یا گھر کے کسی فرد کے ہاتھوں ماری گئیں۔ ان میں سے ۲۴ فی صد واقعات کے مرتکب ان عورتوں کے موجودہ یا سابق شوہر ہوئے، ۲۱ فی صد واقعات بوائے فرینڈز یا گرل فرینڈز کے ہاتھوں پیش آئے جبکہ ۱۹ فی صد واقعات میں خاندان کا کوئی دوسرا فرد ملوث پایا گیا۔اس سال قریبی دوستوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی شرح ایک لاکھ عورتوں میں ۱٫۰۷ جبکہ ایک لاکھ مردوں میں ۰٫۴۷ رہی۔(پیراگراف ۹)

رپورٹ میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ اعداد و شمار حقیقی صورت حال کی مکمل عکاسی نہیں کرتے کیونکہ قریبی ساتھیوں کی جانب سے ہونے والے تشدد اور جنسی زیادتی کی وارداتیں خوف و ہراس اور دیگر وجوہ کی بناء پر بہت ہی کم رپورٹ کی جاتی ہیں۔رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۲ء سے ۲۰۰۰ء تک زنا بالجبر کے صرف ۳۶ فی صد، جنسی زیادتی کی کوشش کے ۳۴ فی صد اور جنسی حملوں کے ۲۶ فی صد واقعات پولیس کو رپورٹ کیے گئے۔(پیراگراف:۱۷)

جیلوں میں بدسلوکی

امریکی جیلوں میں عورتوں سے بدسلوکی کی تفصیلات، اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کی خصوصی نمائندہ کی چشم کشا رپورٹ کے کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی جانب سے بہتری کی کوششوں کے باوجود اب تک امریکی جیلوں میں قید عورتیں ہر قسم کی زیادتیوں کا نشانہ بن رہی ہیں۔ان تفصیلات کا خلاصہ بھی بہت جگہ چاہتا ہے اس لیے محض چند اقتباسات پر اکتفا کر رہے ہیں جن سے مجموعی صورت حال کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔رپورٹ میں اگرچہ تقریباً پچھلے ڈیڑھ عشرے کے حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے لیکن ہم حالیہ چند برسوں کی کیفیت کے حوالے سے رپورٹ کے مندرجات نقل کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

’’جہاں تک جیلوں میں عورتوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی کا تعلق ہے،تو ۲۰۰۹-۲۰۰۸ء کی

ایک رپورٹ نشاندہی کرتی ہے کہ بارہ مہینوں کی مدت میں امریکی جیلوں میں ۴ء۷ فی صد عورتوں کو اپنے مرد قیدی ساتھیوں اور ۲ء۱ فی صد کو جیل کے عملے کے ارکان کے ہاتھوں مختلف نوعیت کی جنسی بدسلوکی، زیادتی، خوف و ہراس اور جنسی حملوں کا تجربہ ہوا۔ انسپکٹر جنرل کے دفتر سے جاری ہونے والی ۲۰۰۹ء کی ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ جیل کے عملے کے مرد ارکان اکثر قیدی عورتوں کی جامہ تلاشی کے دوران جنسی چھیڑ چھاڑ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ عملے کے یہ ارکان اپنے اختیارات اور طاقت کے بل پر قیدی عورتوں کو زبردستی جنسی تعلق پر مجبور کرتے ہیں۔''

''قیدی عورتوں کے جیل کے ساتھیوں سے انٹرویوز سے پتہ چلا کہ قیدی عورتیں بعض اوقات ٹیلیفون تک رسائی، کھانے پینے کی اشیاء اور صابن اور شیمپو جیسی چیزوں کے حصول تک کے لیے جنسی زیادتی قبول کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان میں سے بہت سی پوری زندگی کے لیے ذہنی انتشار، بے چینی اور ڈپریشن جیسے نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ ان تلخ اور ذلت آمیز واقعات کو بھلا نہ پانے کی بناء پر ان میں سے بہت سی عورتیں خودکشی تک کر گزرتی ہیں۔ (پیراگراف: ۳۳-۳۲)[۲۵]

فوج میں جنسی زیادتی روز کا معمول

درج بالا سرخی کے تحت رپورٹ میں کہا گیا ہے: '' فوج کے اندر عورتوں پر جنسی حملے اور انہیں خوف زدہ کرنے کو عورتوں کے خلاف تشدد کی ایک وسیع قسم کے طور پر امریکہ میں بلا تأمل تسلیم کیا جاتا ہے۔ وکلاء بتاتے ہیں کہ عورتیں جب فوج کی ملازمت اختیار کرتی ہیں تو وہ نہ صرف جنگ وجدل کے حوالے سے جسمانی خطرات مول لیتی ہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کی جانب سے جنسی حملوں کے خطرے کا سامنا بھی کرتی ہیں۔ جنسی حملوں کا سامنا اگرچہ مردوں اور عورتوں دونوں کو کرنا پڑتا ہے، تاہم دستیاب اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ نشانہ بننے والوں میں سے بھاری اکثریت جونیئر رینکس کی ۲۵ سال سے کم عمر عورتوں کی ہوتی ہے۔ (پیراگراف: ۲۴)

صورت حال کی سنگینی کا اندازہ رپورٹ میں کیے گئے اس انکشاف سے لگایا جاسکتا ہے کہ

امریکی فوج میں عورتوں کو درپیش ناگفتہ بہ صورت حال پر دو سابق وزرائے دفاع کے خلاف اجتماعی مقدمات بھی دائر کیے گئے ہیں۔اس حوالے سے رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''سابق وزرائے دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ اور رابرٹ گیٹس کے خلاف ،آبرو ریزی اور جنسی حملوں کی شکایات پر کارروائی نہ کرنے ، ان کی تحقیقات نہ کرانے ، مجرموں کو سزا دینے میں ناکام رہنے اور انصاف کی فراہمی کے نظام کو کمزور رکھنے پر متاثرین کی جانب سے اجتماعی مقدمے کے بارے میں بھی خصوصی نمائندے کو بتایا گیا۔مقدمے میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ عصمت دری اور جنسی حملوں کا نشانہ بننے والوں کے خلاف کھلم کھلا خوف زدہ کرنے اور نقصان پہنچانے کی کارروائیاں کی گئیں،جرائم کی شکایت درج کرانے کے معاملے میں ان کی حوصلہ شکنی کی گئی، نیز انہیں اپنی زبان بند رکھنے اور جو زیادتی ان کے ساتھ ہوئی اسے کسی کو نہ بتانے کا حکم دیا گیا۔ (پیراگراف:۲۳)

امریکہ میں عورتوں کے خلاف تشدد خصوصاً جنسی زیادتی اور جرائم پر مبنی اقوام متحدہ کی نمائندہ خصوصی کی اس رپورٹ کے اگلے پیراگراف میں اس حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے کہ فوج میں ہونے والے اس نوعیت کے جرائم عام طور پر ریکارڈ پر نہیں آتے کیونکہ متاثرین چپ رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''کیونکہ فوج میں جنسی حملوں کے بیشتر واقعات کی رپورٹ درج نہیں کرائی جاتی لہٰذا درست اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں۔محکمہ دفاع کے مطابق ،تازہ ترین بے نام سروے سے پتہ چلتا ہے کہ ایکٹو ڈیوٹی عورتوں میں سے۴ء۴ فی صد اور ایکٹو ڈیوٹی مردوں میں سے۹ء فی صد نے اشارہ دیا کہ وہ سروے سے پہلے کے بارہ ماہ کے دوران جبری جنسی تعلق کے تجربے سے گزرے ہیں۔ ان میں سے صرف ۲۹ فی صد عورتوں اور۱۴ فی صد مردوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کی شکایت محکمہ دفاع یا کسی سول اتھارٹی سے کی ہے۔(پیراگراف:۲۴)

فوج میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے واقعات کی رپورٹنگ کے اس قدر کم ہونے کے

اسباب بیان کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی نمائندہ خصوصی کی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ فوج کے تحکمانہ نظام کی وجہ سے زیادتی کا شکار ہونے والے شکایت کرنے کی صورت میں اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ اگر زیادتی کے ذمہ دار، متاثرہ فرد کے افسران میں سے ہوں تو ان کے خلاف شکایت کرنا محال کو ممکن بنانے کی کوشش کے مترادف ہوتا ہے اور متاثرین اکثر محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اپنی فوجی ملازمت یا انصاف میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ (پیراگراف : ۲۷) رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ متاثرین کے وکلاء نے بتایا کہ شکایت کرنے کی صورت میں متاثرین بااثر ملزمان کی جانب سے انتقامی کارروائی کا خوف رکھتے ہیں کیونکہ کمانڈر عام طور پر شکایت کرنے والوں کو ملزمان کے انتقامی اقدامات سے تحفظ مہیا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ (پیراگراف:۲۸)

خاتون رکن کانگریس کی گواہی

سی این این کی ۳۱ جولائی ۲۰۰۸ء کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''کانگریس کی ایک خاتون رکن کے بقول اُن کا منہ اس وقت کھلا کا کھلا رہ گیا جب سابق فوجیوں کے ایک اسپتال میں فوجی ڈاکٹروں نے انہیں بتایا کہ دس میں سے چار عورتوں نے شکایت کی ہے کہ فوجی ملازمت کے دوران انہیں جنسی حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ جبکہ ایک سرکاری رپورٹ کی رو سے یہ تعداد اس سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ ڈی کیلیفورنیا سے کانگریس کی رکن جین ہرمین نے یہ انکشاف کانگریس کے ایک پینل کے سامنے بیان دیتے ہوئے کیا جو یہ تحقیق کررہا ہے کہ فوج میں جنسی زیادتیوں کے واقعات سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ جین ہرمین نے بتایا کہ انہوں نے حال ہی میں لاس اینجلس میں سابق فوجیوں کے ایک اسپتال کا دورہ کیا، جہاں انہیں فوج میں عورتوں کی آبروریزی کی خوفناک کہانیاں سنائی گئیں۔''

جین ہرمین کے مطابق جنسی حملوں کا نشانہ بننے والی ان عورتوں میں سے ۲۹ فی صد نے انکشاف کیا کہ فوجی ملازمت کے دوران ان کی عزت لوٹی گئی۔ ان عورتوں نے اپنے مستقل خوف،

بے بسی کے احساس اور مسلسل ابتر ہوتی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں بتایا جس میں وہ اسی وقت سے مبتلا ہیں جب انہیں اس ظلم کا ہدف بنایا گیا۔''

جین ہرمین نے صورت حال کی سنگینی کو یوں واضح کیا: ''ہماری فوج میں یہ چیز ایک وباء کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ امریکی فوج میں ملازمت کرنے والی عورتیں آج عراق میں دشمن کی گولی سے مرنے سے کہیں زیادہ اپنے مرد ساتھیوں کے ہاتھوں آبروریزی کے خطرے سے دوچار ہیں۔''

امریکی کانگریس کی اس خاتون رکن کے بقول ۲۰۰۷ء میں فوج کے اندر جنسی حملوں کے ۲۲۱۲ کیس رپورٹ ہوئے مگر ان میں سے صرف ۱۸۱ یعنی محض ۸ فی صد کورٹ مارشل کے لیے بھیجے گئے۔ جین ہرمین نے بتایا کہ اس کے مقابلے میں شہری معاشرے میں ایسے معاملات کے عدالتوں تک پہنچنے کی شرح ۴۰ فی صد ہے۔ [۲۶]

متاثرہ عورتیں زندہ درگور

امریکی فوج میں اپنے مرد ساتھیوں کی بہیمانہ ہوس کا نشانہ بننے والی ان عورتوں کی دادرسی کس حد تک ہوتی ہے اور اپنی بقیہ زندگی میں انہیں کن ذہنی، نفسیاتی اور سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دستیاب واقعاتی حقائق سے اس کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ امریکی فوج میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی پر امریکی اخبار ڈینور پوسٹ (Denver Post) سے وابستہ ایمی ہرڈی (Amy Herdy) اور مائلز موفیٹ (Miles Moffeit) نے نو ماہ کی تحقیق کے بعد ایک رپورٹ تیار کی جو اخبار کی ۱۶ تا ۱۸ نومبر ۲۰۰۳ء کی اشاعتوں میں بالاقساط شائع ہوئی۔ ۲۰۰۴ء میں اسے Betrayal in the Ranks کے عنوان سے مستقل دستاویز کے طور پر بھی شائع کیا کردیا گیا۔

ڈینور پوسٹ کی اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکی فوج میں اپنے مرد ساتھیوں کی ہوس کا نشانہ بننے والی ان مظلوم عورتوں کی دادرسی کے بجائے عموماً انہیں خاموش رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کے خلاف جنسی تشدد کے مرتکب مجرموں کو عام طور پر کسی باز پرس اور سزا کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ رپورٹ میں کولوریڈو ایئر فورس اکیڈمی کے اسکینڈل کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ

۱۴۲ کیس رپورٹ ہونے کے باوجود ایک ملزم کو بھی سزا نہیں دی گئی۔

ان رپورٹروں نے ایسی مزید مثالیں دیتے ہوئے لاس ویگاس میں ۱۹۹۱ء میں ہونے والے نیوی ٹیل ہک کنونشن کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس موقع پر سو سے زائد افسروں نے درجنوں خاتون اہلکاروں کو جنسی طور پر ہراساں کیا مگر جب اس سلسلے میں نیوی کی طرف سے انکوائری ہوئی تو مجرم افسروں نے تحقیقاتی عمل کو بالکل سبوتاژ کر کے رکھ دیا اور ان میں سے ایک کو بھی سزا نہیں دی جاسکی۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ امریکہ کا فوجی نظام یہ رعایت جن مجرموں کو دے رہا ہے، ان کے جرم کے اثرات ونتائج کیا ہیں اور جو عورتیں ان کی درندگی کا نشانہ بنتی ہیں، ان کی بقیہ زندگی کس طرح گزرتی ہیں۔ ڈینور پوسٹ نے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ایسی ۶۰ عورتوں سے بات چیت کی جنہوں نے انتقام کے خوف یا مجرموں کے خلاف کسی کارروائی سے مایوس ہونے کی بناء پر اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی کہیں رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔

اخبار لکھتا ہے کہ مجرمانہ حملوں کا نشانہ بننے والی درجنوں سابق فوجی خواتین اہلکاروں نے بتایا کہ اذیت کے اندرونی احساس کے سبب ان کے کیریئر تباہ ہو گئے۔ انہوں نے منشیات اور کثرت شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی جس سے ان کی زندگیاں برباد ہوگئیں۔

ماریان ہُڈ ایسی ہی ایک مظلوم سابق امریکی سپاہی ہے۔ اس نے اپنے کرب کا اظہار جن الفاظ میں کیا وہ دل دہلا دینے والے ہیں، ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی فوج میں عورتوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا شرمناک اور وحشیانہ سلوک کس طرح خود امریکہ کے خلاف نفرت کے فروغ کا سبب بن رہا ہے۔ سابق فوجی ہونے کے باوجود امریکی پرچم لہرانے سے انکار کرنے والی ماریان ہڈ کہتی ہے:

''پہلے جب میں امریکی پرچم پر نظر ڈالتی تو یہ مجھے سرخ، سفید اور نیلا دکھائی دیتا تھا، مگر اب میں اس پر صرف خون کے رنگ دیکھتی ہوں۔ سرخ رنگ اس خون کی علامت ہے جو میرے بدن

سے بہا۔ نیلا رنگ ان چوٹوں کی نمائندگی کرتا ہے جو میرے جسم نے سہیں۔اور سفید رنگ میرے خوفزدہ چہرے کا ہے۔ میں اپنے ملک کے لیے ماری پیٹی گئی اور میری عزت لوٹی گئی۔اسے کافی سمجھا جانا چاہیے۔''[۲۷]

مغربی عورت کا حال زار: فطرت سے بغاوت کا نتیجہ

مغربی تہذیب نے ماں باپ، اور شوہر و بیوی کی حیثیت سے عورت اور مرد کے فطری دائرہ کار، صنفی وجسمانی تقاضوں اور نفسیاتی و جذباتی مطالبات کے کھلے فرق کو نظر انداز کر کے زندگی کے ہر میدان میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ لا کھڑا کرنے کی جو غلطی کی تھی، مغرب کی عورت کو درپیش مسائل اور ذلت انگیز حالات، جن کا کچھ ذکر سطور بالا میں ہوا، فی الحقیقت اسی غلطی کا نتیجہ ہیں۔مغربی عورت گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ مردوں کی طرح معاشی جدوجہد میں بھی جوت دی گئی ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے ساتھ کام ضرور کر رہی ہے لیکن عملاً وہ مردوں کا دل بہلانے کا کھلونا بن گئی ہے۔اس طرز زندگی کے کئی عشروں کے تجربے نے مغربی عورت پر یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ آزادی و مساوات کے نام پر یہ سودا اسے بہت مہنگا پڑا ہے۔ لہٰذا آج مغربی عورت دوبارہ گھر کی پناہ گاہ میں واپس جانے کی آرزومند ہے۔

مغربی عورتوں میں اسلام کی حیرت انگیز مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ اسلامی تعلیمات عورت کو گھر کا مرکز بناتی ہیں اور معاشی جدوجہد میں شرکت کی کوئی ذمہ داری اس پر عائد کیے بغیر محبت، عزت اور احترام کا وہ مقام دیتی ہیں، جس کا کوئی تصور مغربی معاشرے میں نہیں پایا جاتا۔مسلمان ہونے والی مغربی خواتین اپنے قبول اسلام کے اسباب میں اسلام کے ان اوصاف کا عموماً بطور خاص ذکر کرتی ہیں۔تاہم ذیل میں اس حوالے سے کئی ہزار برطانوی عورتوں کی ایک کھلی گواہی پیش کی جا رہی ہے جو ہر معقول شخص کے لیے سوچ بچار کا بڑا سامان رکھتی ہے۔

۹۴فی صد برطانوی عورتیں سپر وومین رول ماڈل سے بیزار

برطانیہ کی خواتین بیک وقت گھریلو ذمہ داریوں اور ملازمت کی ذمہ داریوں کو بھاری بوجھ محسوس کرتی ہیں۔ خواتین کے بہت سے میگزین اکثر ایسی آراء اور معلومات پیش کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹاپ سانتے (Top Sante) نامی برطانوی میگزین کے ایک سروے کے مطابق، جس کی تفصیلات ہم نے برطانوی اخبار ڈیلی میل میں شائع ہونے والی رپورٹ سے لی ہیں، برطانیہ کی ۹۴فی صد ملازمت پیشہ خواتین کا کہنا ہے کہ وہ زوجیت، مادریت اور ملازمت کے تقاضے بیک وقت پورے کرتے کرتے بے دم ہو چکی ہیں اور اس سپر وومن رول ماڈل سے نجات کی آرزومند ہیں۔

میگزین کی ایڈیٹر جولیٹ کیلو (Julliet Kellow) جنہوں نے برطانیہ، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ کی پانچ ہزار ملازمت پیشہ عورتوں کے انٹرویو کا اہتمام کر کے یہ جائزہ پیش کیا ہے، کہتی ہیں: "It is time for super woman to put back in her box" یعنی وقت آ گیا ہے کہ سپر وومن واپس اپنے گھر کا رخ کرے اور اپنی اصل ذمہ داریاں نبھائے۔

سروے میں کہا گیا ہے کہ سپر وومن کا یہ رول ماڈل ان عام عورتوں کے لیے قطعی سازگار نہیں جن کے پاس گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے بچے کھلانے والی اناؤں، صفائی ستھرائی کرنے والی خادماؤں، پرسنل سکریٹریوں اور ہیر ڈریسروں وغیرہ کی فوج نہیں ہے۔ سروے کے مطابق ہر دس میں سے آٹھ ملازمت پیشہ عورتوں کا خیال ہے کہ ماں اور باپ دونوں کی کل وقتی ملازمت خاندانوں کے ٹوٹنے کا ایک بڑا سبب ہے۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ ملازمت پیشہ عورتوں کے تعلقات اپنے شریک حیات کے ساتھ تلخ ہو جاتے ہیں کیونکہ بیشتر عورتیں سمجھتی ہیں کہ مرد اپنا بوجھ اتنا نہیں اٹھاتے جتنا اٹھا سکتے ہیں۔ یہ خیال ۸۴فی صد عورتوں نے ظاہر کیا ہے۔ اس کے باوجود ایک تہائی عورتوں کے لیے اپنی ملازمت چھوڑ کر اپنے آپ کو گھر کے لیے وقف کر دینا ممکن نہیں کیونکہ وہ اپنے شوہروں یا مرد پارٹنروں کی نسبت زیادہ کماتی ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ برطانیہ میں بھی، جو موجودہ مغربی تہذیب کا امام اول ہے اور جس

نے پوری مغربی دنیا کو اس راہ پر لگایا ہے، مساواتِ مرد وزن کے تمام دعووں کے باوجود سروے کے مطابق اب تک عورتیں ہی گھر اور خاندان کے امور کے لیے بنیادی طور پر جواب دہ اور ذمہ دار ہیں حالانکہ وہ مردوں ہی کی طرح اپنا پورا دن ملازمت کی مصروفیت میں گزار کر تھکی ہاری گھر پہنچتی ہیں۔اپنی ان سہ طرفہ مستقل اور سخت ذمہ داریوں کی مسلسل ادائیگی نے انہیں زمین سے لگا دیا ہے۔جولیٹ کیلو کا کہنا ہے کہ ایک کل وقتی گھریلو خادمہ، ملازمت پیشہ عورتوں کی اکثریت کے لیے دیومالائی شے ہے۔بہتر معاوضے والی جزوقتی ملازمتیں ان گھر بار والی عام ملازمت پیشہ عورتوں کے مسئلے کا ایک حد تک حل ہوسکتی ہیں لیکن یہ انتہائی کمیاب ہیں اوران کا حصول نہایت دشوار ہے۔ سروے کے مطابق ۵۷ فی صد برطانوی کمپنیاں اب تک اپنے ہاں ملازمت کرنے والی عورتوں کو ماں بن جانے کی صورت میں کوئی رعایت اورکوئی الاؤنس نہیں دیتی ہیں خواہ ملازمت جاری نہ رکھ پانے کی وجہ سے کمپنیوں کوان کے تجربے اور صلاحیتوں سے محروم ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

سروے میں بتایا گیا ہے کہ گھر اور بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ملازمت کی مشقت عورتوں کی صحت کو بری طرح متاثر کررہی ہے۔ذہنی اور جسمانی طور پر تازہ دم ہوکر صحت مند رہنے کے لیے کم سے کم ناگزیر وقت بھی ان عورتوں کے پاس نہیں ہوتا۔ان غریب عورتوں کا طرز زندگی پریشر ککر جیسا بن کر رہ گیا ہے۔وہ اپنی مختلف النوع ذمہ داریوں کی بناء پر مسلسل دباؤ میں رہتی ہیں اور انہیں ایک کام سے دوسرے کام کی طرف دوڑتے رہنا پڑتا ہے چنانچہ ان کے رویے میں جارحیت بڑھتی چلی جارہی ہے۔سروے میں ملازمت پیشہ عورتوں کی عمومی صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اگر مالی مجبوریاں نہ ہوں تو برطانیہ کی ۴۸ فی صد ملازمت پیشہ عورتیں صرف آرام کرنا پسند کریں گی۔۳۲ فی صد گھرداری اختیار کرنے کا فیصلہ کریں گی اور صرف ۲۰ فی صد ملازمت جاری رکھنے کو ترجیح دیں گی۔[۲۸]

سستی لیبر کے لیے سرمایہ داری کی چال

مغرب میں عورت کا یہ حال زار دراصل سرمایہ دارانہ نظام کی عورت کے خلاف خوفناک سازش کا نتیجہ ہے جسے آزادی نسواں کا دلکش اور پرفریب نام دیا گیا۔اب یہ کوئی راز نہیں کہ آزادی نسواں اور مساوات مردوزن کی تحریکوں کے نام پر عورت کو گھرداری اور نئی نسل کی پرورش اور تربیت کے فطری فریضے کی ادائیگی کے لیے فارغ رکھے جانے سے دراصل روکا ہی اس لیے گیا تھا تاکہ اسے گھر سے باہر لاکر سرمایہ داری نظام کی ضرورت کے مطابق کارخانوں اور دفاتر کے لیے سستی لیبر فراہم کی جاسکے،اورعشروں سے ان معاشروں میں عورت کا عملی کردار یہی ہے۔مگر ظاہر ہے کہ فطرت سے بغاوت کے کبھی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوتے چنانچہ مغرب، خاندانی نظام کے تقریباً مکمل خاتمے کی صورت میں آج فطرت کے خلاف کی گئی اس بغاوت کے انجام سے دوچار ہے۔جس پر چیخ پکار تو سنائی دیتی رہتی ہے مگر اب اس گاڑی کو ریورس گیئر لگانا بہت مشکل ہے۔

عورت کی معاشی جدوجہد،خوشحالی کا ذریعہ؟

ایک عام تصور یہ ہے کہ عورت کو چوکوں اور بازاروں میں کھینچ لانے سے مغرب کا خاندانی نظام اور گھریلو سکون چاہے کتنا ہی برباد ہوگیا ہو مگر کم از کم معاشی طور پر عام آدمی بھی بہت خوشحال ہوگیا ہے، لیکن یہ بھی بس ایک خیالِ خام ہی ہے۔ امریکہ کی وَرمونٹ یونیورسٹی کے پروفیسر ہک گٹ مین(Huck Gutman)امریکہ میں معاشی عدم مساوات کے موضوع پر اپنے ایک مقالے میں جو پاکستان کے ممتاز انگریزی اخبار ڈان میں بھی یکم جولائی ۲۰۰۲ء کو شائع ہوا، لکھتے ہیں:

''اگرچہ لگتا ہے کہ امریکہ کے لوگ ناقابل تصور امارت سے لطف اندوز ہورہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیشتر امریکیوں کو پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا اور ایک قابل لحاظ تعداد بھوکی رہ جاتی ہے۔'' وہ کہتے ہیں کہ ''گزشتہ صدی کی آخری چوتھائی جس میں امریکی کارپوریشنوں نے پوری دنیا میں اپنی طاقت اور اثر ورسوخ بڑھا کر بھاری منافع کمایا، اس پوری مدت میں امریکی محنت کش کو کوئی اضافی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔امریکی کارکنوں کی اجرتیں ۱۹۷۸ء سے ایک ہی سطح پر برقرار

ہیں یا گھٹ رہی ہیں۔''

اس کے مقابلے میں اعلیٰ افسران کے معاوضے بڑھتے چلے گئے اور اس تحقیق کے مطابق آج کیفیت یہ ہے کہ ان کی آمدنی ایک عام کارکن سے سات سو گنا تک زیادہ ہے۔ پروفیسر گٹ مین نے اسے زیادہ آسان پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک چیف ایگزیکٹو آفیسر آدھے دن میں اتنا کمالیتا ہے جو ایک مزدور سال بھر میں بھی مشکل سے کما پاتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ امریکہ کے ایک فی صد امیر ترین لوگ، نیچے کے ۹۵ فی صد لوگوں سے زیادہ وسائل کے مالک ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اس بات پر یقین کرنا ان لوگوں کے لیے مشکل ہوگا جو ٹی وی پروگراموں میں امریکیوں کو اسپورٹس گاڑیاں چلاتے اور سجے سجائے گھروں میں بسا دیکھتے ہیں لیکن معاشی حقیقت یہ ہے کہ امریکی خاندانوں کے معیار زندگی میں جو اضافہ بھی ہوا ہے، وہ تقریباً سب کا سب عورتوں کے بڑے پیمانے پر ورک فورس میں شامل ہونے کا نتیجہ ہے، اور گھریلو اخراجات جو پہلے ایک کمانے والے کی آمدنی سے پورے ہو جاتے تھے، اب ان کے پورے ہونے کا دارومدار دو افراد کی آمدنی پر ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال، گھر کا انتظام، کھانا پکانا، یہ چیزیں اب روزمرہ کام کا حصہ نہیں بلکہ اضافی بوجھ ہیں۔''[۲۹]

واضح رہے کہ امریکہ سمیت پوری مغربی دنیا بے انصافی پر مبنی نظام سرمایہ داری کے سبب گزشتہ کئی برس سے جس معاشی بحران کا شکار ہے، اس کی وجہ سے عام آدمی کے حالات مزید ابتر ہوئے ہیں اور امیر و غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے تفاوت کے باعث پوری مغربی دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف عوامی احتجاج کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ عورت کا استحصال اس نظام کا ایک بنیادی وصف ہے۔ زوجیت، مادریت اور خانہ داری کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مردوں کی طرح معاشی جدوجہد بھی اس کی مجبوری بنادی گئی ہے جبکہ اسلام میں مردوں اور عورتوں کے دائرہ کار واضح طور پر الگ الگ ہیں۔

اسلامی نظام میں عورت کو گھر کی پناہ گاہ سے باہر آنے پر مجبور کیے بغیر تمام حقوق حاصل

ہوتے ہیں اور اس کی مکمل کفالت اور تمام ضروریات کی تکمیل مرد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مسلم دنیا میں خاندان کا ادارہ اسی بناء پر آج بھی مستحکم ہے اور مسلمان معاشروں میں عورتیں بالعموم ان مسائل سے دوچار نہیں ہیں جن سے مغرب کی عورت کو شب و روز سابقہ درپیش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کی عورت اس سپر وومن رول ماڈل سے بیزار ہوچکی ہے جس کا جھانسا دے کر اسے اپنے گھر کی جنت سے نکال کر کارگاہوں اور بازاروں کی زینت بنایا گیا ہے اور پانچ ہزار عورتوں سے انٹرویو کے بعد ان کی بھاری اکثریت کی آراء کی روشنی میں ٹاپ سانتے کی ایڈیٹر کو کہنا پڑا ہے کہ: Working women are heartily sick of these do it all role models. It is time for superwoman to be put back in her box." (ملازمت پیشہ عورتیں ہر چیز کی ذمہ داری والے اس طرز زندگی سے شدید طور پر بیزار ہوچکی ہیں، وقت آگیا ہے کہ سپر وومن اپنے گھر واپسی کی راہ لے۔)[۳۰]

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ خدائی ہدایات سے بے نیاز ہوکر اور فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے مغربی تہذیب نے عورت کو مرد بنانے کی جو احمقانہ کوشش کی، اس کے نتیجے میں وہ نہ پوری طرح مرد بن سکی نہ پوری عورت رہ سکی۔ اس بناء پر آج وہ شدید مسائل کا شکار اور اس صورت حال سے چھٹکارے کی آرزومند ہے۔ یہ کیفیت اسلام کی جانب مغربی خواتین کے رجوع کا ایک بنیادی سبب ہے۔

1- http://www.guardian.co.uk/society/2009/jun/05/pregnant-women-targeted-redundancy?INTCMP=ILCNETTXT3487

2- http://www.guardian.co.uk/society/2011/aug/31/cmi-equal-pay-report

3- http://www.guardian.co.uk/business/2011/oct/13/shocking-lack-women-directors-ft

4- http://www.guardian.co.uk/society/2007/aug/22/guardiansocietysupplement.crime1

5- http://www.guardian.co.uk/uk/2011/jul/02/human-trafficking-laws-immigration-control

6- http://www.whiteribboncampaign.co.uk/Resources/violence_against_women

7- Walby, S. & Allen, J. (2004) Domestic violence, sexual assault and stalking: Findings from the British Crime Survey. Home Office. London.

8- HM Government (2007) Cross-government Action Plan on Sexual Violence and Abuse. Home Office. London.

9- Walby, S. & Allen, J. (2004) Domestic violence, sexual assault and stalking: Findings from the British Crime Survey. Home Office. London.

10- Amnesty UK (2005) Sexual Assault Research. Amnesty.

11- Povey, D. (2005) Crime in England and Wales 2003/2004: Supplementary Volume 1: Homicide and Gun Crime. Home Office Statistical Bulletin No. 02/05. Home Office. London; Department of Health (2005) Responding to Domestic Abuse. DH. London. (from 'Statistics on Domestic Violence': www.womensaid.org.uk)

12- Dodd, T. et al (2004) Crime in England and Wales 2003-2004. Home Office. London (from 'Statistics on Domestic Violence'

www:womensaid.org.uk

13- Forced Marriage: A Wrong not a Right, Home Office and Foreign & Commonwealth Office, 2005

14- S Walby, The Cost of Domestic Violence

15- http://news.bbc.co.uk/2/hi/uk_news/2752567.stm

16- http://zcommunications.org/violence-against-women-by-ian-sinclair

17- Gill Hague and Ellen Malos, Domestic violence. Action for change (New Clarion Press, Cheltenham, 2005), p. 6.

18- http://www.guardian.co.uk/uk/2007/jul/21/ukcrime.immigrationpolicy

19- Joanna Bourke, Rape: a history from 1860 to present Virago Press Ltd, London, 2007

20- http://www.guardian.co.uk/society/2007/jul/03/crime.penal

21- http://www.now.org/news/blogs/index.php/sayit/2010/02/11/working-conditions-for-women-in-u-s-lag-behind-europe

22- http://now.org/press/04-11/04-12.html

23- http://www.ohchr.org/en/NewsEvents/Pages/DisplayNews.aspx?NewsID=11479&LangID=E

24- http://www2.ohchr.org/english/bodies/hrcouncil/docs/17session/A.HRC.17.26.Add.5_AEV.pdf

25- http://nowfoundation.org/issues/violence/Oct2011SRVAWwebinar.html

26- http://edition.cnn.com/2008/US/07/31/military.sexabuse/index.html?eref=rss_topstoris

27- http://extras.denverpost.com/justice/tdp_betrayal.pdf

28- http://www.dailymail.co.uk/news/article-123003/Sick-Superwoman.html

29- http://www.commondreams.org/views02/0701-05.htm

30- http://www.dailymail.co.uk/news/article-123003/Sick-Superwoman.html

باب چہارم

اسلام بہتر انتخاب کیوں؟

مغربی ماہرین اور نومسلم خواتین کا اظہارِ خیال

خواتین کے حقوق کے حوالے سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے اور اس ضمن میں مسلم دنیا کے مقتدر طبقوں کے انتہائی شرمسارانہ رویے کے باوجود مغربی خواتین بڑی تعداد میں اسلام کیوں قبول کر رہی ہیں؟ مغرب کے علمی حلقوں میں یہ سوال زیر بحث ہے اور اس صورت حال کے اصل اسباب کا کھوج لگانے کی جستجو جاری ہے۔ نج میگن (Nijmegen) یونیورسٹی نیدرلینڈ میں سماجی علوم کی معلّمہ کیرن وین نیوکرک (Karin van Nieuwkerk) نے ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آنے والی اپنی تالیف Women Embracing Islam Gender and Conversion in the West (خواتین میں اسلام کی قبولیت ۔مغرب میں صنف اور تبدیلیٔ مذہب) میں اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے تعارف میں کہا گیا ہے:

''مغرب میں بہت سے لوگ اسلام کو ایسے مذہب کے طور پر دیکھتے ہیں جو نجی اور اجتماعی زندگی میں خواتین پر پابندیاں عائد کرتا اور انہیں ذیلی حیثیت دیتا ہے۔ اس کے باوجود مغربی یورپ اور امریکہ میں عورتیں حیرت انگیز تعداد میں اسلام قبول کر رہی ہیں۔ وہ کیا چیز ہے جو ان عورتوں کو ایک ایسے عقیدے کی طرف کھینچتی ہے جو مغربی عیسائیت اور مغربی سیکولرازم دونوں سے نمایاں طور پر مختلف ہے؟ تبدیلی مذہب سے انہیں کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں اور اس کی کیا قیمت انہیں ادا کرنا پڑتی ہے؟ نیا عقیدہ اختیار کرنے کے بعد مغربی خواتین کس طرح زندگی گزارتی ہیں، اور ان کی تبدیلی مذہب، ان کے خاندانوں اور حلقہ احباب کو کس طور پر متاثر کرتی ہے۔ مذہب بدلنے والی عورتیں اسلامی اقدار کو اپنے بچوں میں کس طرح منتقل کرتی ہیں؟ یہ اُن میں سے چند

سوال ہیں جن کے جواب اسلام قبول کرنے والی عورتوں سے حاصل کیے جانے چاہییں۔''[۱]

اپنے موضوع پر اس انتہائی اہم تالیف کی خصوصیات تعارفی سطور میں یوں بیان کی گئی ہیں:

''صنف کی بنیاد پر قبول اسلام کے اس اولین تحقیقی مطالعے میں ممتاز تاریخ دانوں، عمرانی علوم، ماہرین بشریات اور علمائے مذاہب نے اس بات کی تحقیق کی ہے کہ امریکہ، کئی یورپی ملکوں اور جنوبی افریقہ میں غیر مسلم عورتیں اسلام کو کیوں اپنا رہی ہیں۔ اسلام قبول کرنے والی عورتوں سے تفصیلی بات چیت کرکے ان مصنفوں نے اِن کی زندگی کے اُن تجربات کو کھنگالا ہے جو اِن کے مسلمان ہونے کا سبب بنے اور اُن ترغیبات کا جائزہ لیا ہے جو اسلام کی مختلف شکلوں اور ''نیشن آف اسلام'' (افریقی نژاد امریکیوں کی ایک تحریک) میں عورتوں کے لیے پائی جاتی ہیں۔''

اس کے بعد ماہرین کی تحقیقات کا نچوڑ ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

''یہ مصنفین جس نتیجے پر پہنچے وہ یہ ہے کہ اگرچہ عوامل کا کوئی واحد مجموعہ اس امر کی وضاحت نہیں کرسکتا کہ مغربی عورتیں اسلامی عقیدے کو کیوں اپنا رہی ہیں لیکن چند مشترکہ محرکات ضرور سامنے آتے ہیں۔ ان میں خاندان اور برادری کے لیے اسلام کے انتہائی لحاظ و احترام کی کشش، اخلاق و کردار کے معاملے میں اس کے سخت اصولی معیارات، اس کے مذہبی تصورات کی معقولیت وروحانیت نیز عیسائیت پر عدم اطمینان اور مغربی کلچر کی جنسی انارکی سے بیزاری کے عوامل شامل ہیں۔''[۲]

اس عالمانہ تحقیقی مطالعے میں مغربی خواتین کی جانب سے قبول اسلام کے ان اسباب کے تعین سے واضح ہے کہ وہ مغربی معاشرے کی نسبت اسلام میں اپنے لیے زیادہ احترام، زیادہ حقوق اور ان حقوق کا بہتر تحفظ پاتی ہیں، نیز حضرت عیسیٰ کی اصل تعلیمات سے منحرف ہوجانے والی موجودہ عیسائیت کے غیر منطقی عقائد کے مقابلے میں اسلام کی معقول تعلیمات انہیں زیادہ اپیل کرتی ہیں۔

اسلام عورتوں کو کیا کچھ دیتا ہے
برطانوی صحافی ایوان رِڈلے کا اظہار خیال

مغرب میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ ایک مدت سے جاری ہے۔ افغانستان میں طالبان حکومت قائم ہوئی تو اس کے خلاف ایک بڑا الزام عورتوں کے حقوق کی پامالی کا بھی تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس پروپیگنڈے کی تردید کا بیڑہ مغرب کی ایک ایسی ممتاز خاتون صحافی نے اٹھایا جسے مغرب کی نگاہ میں عورتوں کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کرنے والے اِن ہی طالبان کی قید میں رہنے کا تجربہ ہوا اور اِن کا حسن سلوک ہی اسلام سے اُس کی وابستگی کا سبب بن گیا۔ یہ برطانوی صحافی ایوان رڈلے (Yvonne Ridley) کا ذکر ہے جو دشمن کی جاسوسی کے شبہ میں گرفتار ہوئی تھی۔

رڈلے نائن الیون واقعات کے بعد عین اس وقت افغانستان پہنچی تھی جب امریکی حکومت اپنے اتحادیوں کے ساتھ طالبان حکومت کے خاتمے اور افغانستان پر تسلط کے لیے فوج کشی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ وہ طالبان حکومت میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی مبینہ زیادتیوں اور مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے اخبار کے لیے اس موضوع پر ایک مفصل رپورٹ لکھنے کی خاطر ایک مکمل باپردہ افغان خاتون کے روپ میں افغانستان پہنچی، لیکن ایک موقع پر برقعے سے باہر آجانے والا اُس کا کیمرہ طالبان کی ایک چیک پوسٹ پر دیکھ لیا گیا جس سے یہ راز فاش ہوگیا کہ وہ ایک انگریز عورت ہے اور خفیہ طور پر افغانستان میں داخل ہوئی ہے۔

اس کے بعد وہ دس دن تک گرفتار رہی لیکن اِس عرصے میں اُس کے ساتھ ان طالبان نے جنہیں مغرب میں تہذیب اور شائستگی سے نابلد ہونے اور عورتوں کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز اور انسانیت سوز سلوک کرنے کے حوالے سے بری طرح بدنام کر رکھا گیا تھا، عزت و احترام پر مبنی ایسا مثالی برتاؤ کیا جو اس کے لیے ناقابل تصور تھا، وہ قدرتی طور پر اُن کے اِس حسن سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور رہائی کے بعد قرآن اور اسلام کا مطالعہ کر کے مسلمان ہوگئی۔ رڈلے

نے یہ پوری روداد اپنی کتاب "In the Hands of the Taliban" میں لکھی ہے۔ ''طالبان کی قید میں'' کے نام سے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ طالبان کی قید میں رہ کر اسلام سے متاثر ہونے والی یہی مغربی خاتون، امریکی حکام کے ہاتھوں شدید ظلم و بے انصافی اور انسانیت سوز سلوک کا نشانہ بننے والی عافیہ صدیقی کے معاملے کو منظر عام پر لانے کا ذریعہ بنی اور یوں عورت کے احترام کے حوالے سے مغرب اور اسلام کے طرزِ عمل کا فرق کھل کر دنیا کے سامنے آ گیا۔

اب یہ برطانوی صحافی عالمی سطح پر اسلام کی پرجوش مبلغ اور داعی ہے اور مغرب میں سلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ بی بی سی کو دیے جانے والے ایک انٹرویو میں جب رڈلی سے مسلمان معاشروں میں عورتوں کو درپیش مسائل کے حوالے سے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا:

''مسلمان ملکوں میں جبر کا نشانہ بننے والی عورتیں یقیناً ہیں، لیکن میں آپ کو Tyneside کے گلی کوچوں میں بھی ایسی مظلوم عورتیں دکھا سکتی ہوں۔ ظلم و جبر ایک کلچر ہے، یہ اسلام نہیں ہے۔ قرآن اس حقیقت کو آئینے کی طرح صاف کر دیتا ہے عورت اور مرد برابر ہیں۔''[۳]

حجاب اور نقاب کے خلاف مغربی دنیا میں جاری مہم کے دوران جب برطانوی وزیر خارجہ سمیت برطانیہ کے بعض سیاستدانوں نے بھی اس کی حمایت شروع کی تو رڈلے نے ''مجھے نقاب سے محبت کیسے ہوئی؟'' (How I came to love the veil) کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں بڑی جامعیت کے ساتھ واضح کیا کہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلام میں عورت کا مقام کتنا بلند ہے، اُس کے فطری تقاضوں کو برقرار رکھتے ہوئے کس طرح مکمل مساوی حقوق اُسے دیے گئے ہیں اور جن حوالوں سے اسلام کو عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے، اُن کی حقیقت کیا ہے۔

اپنے اس مضمون میں ایوان رِڈلے بتاتی ہیں کہ طالبان کی قید سے رہائی کے بعد انہوں نے

لندن پہنچ کر اپنے وعدے کے مطابق قرآن کا مطالعہ شروع کیا اور جو حقیقت اُن پر کھلی اس نے انہیں حیرت زدہ کر دیا۔ وہ لکھتی ہیں:

''میرا خیال تھا کہ قرآن کے ابواب میں بتایا گیا ہوگا کہ اپنی بیوی کو کس طرح مارنا پیٹنا چاہیے اور بیٹیوں کو کس طرح کچل کر رکھنا چاہیے، لیکن اس کے بجائے میں نے ایسی عبارتیں دیکھیں جو عورتوں کی آزادی کی علم بردار اور ضامن ہیں۔ چنانچہ اپنی رہائی کے ڈھائی سال بعد میں نے اسلام قبول کرلیا۔''

عورتوں کے حوالے سے اسلام پر لگائے جانے والے الزامات کی حقیقت واضح کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

''میں نقاب کی حمایت اور مخالفت، دونوں جانب رہنے کی بناء پر، آپ کو بتا سکتی ہوں کہ بیشتر مغربی مرد سیاستداں اور صحافی جو دنیائے اسلام میں عورتوں کی مظلومیت پر ماتم کناں رہتے ہیں، انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس چیز کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ وہ نقاب، لڑکیوں کا کم عمری میں بیاہ،، عزت کے نام پر قتل اور جبری شادیوں کے موضوعات چھیڑتے ہیں اور غلط طور پر ان کے لیے اسلام کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا یہ غیظ و غضب محض اُن کی جہالت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ثقافتی معاملات اور رسوم و رواج ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔''

ایوان رڈلے قرآن کی روشنی میں بتاتی ہیں کہ اسلام عورتوں کو ان کے تمام حقوق چودہ سو سال پہلے ہی دے چکا ہے جبکہ مغرب کی عورت اب بھی اس منزل سے بہت دور ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''قرآن کا توجہ کے ساتھ مطالعہ یہ حقیقت منکشف کرتا ہے کہ مغرب میں آزادئ نسواں کے علم برداروں نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں جن حقوق کے لیے جنگ کی، تقریباً وہ سب کے سب مسلمان عورتوں کو چودہ سو سال پہلے مل چکے تھے۔ اسلام میں عورتیں روحانیت، تعلیم اور قابلیت میں مردوں کے برابر سمجھی جاتی ہیں، بچوں کی پیدائش کو عورت کے قابل قدر تحفے اور ان کی پرورش و پرداخت کو مثبت وصف کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔''

ایوان رڈلے اپنے مضمون میں اسلام کے مقابلے میں مغرب میں عورت کے مرتبے کے فرق کو عیاں کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میں برسوں سے عورتوں کے حقوق کی ایک مغربی علم بردار تھی، لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ حقوق نسواں کی علم بردار مسلمان عورتیں اپنی سیکولر ساتھیوں سے زیادہ انقلابی ہیں۔ مغربی دنیا میں منعقد ہونے والے بھونڈے مقابلہ ہائے حسن سے ہم نفرت کرتے ہیں اور ۲۰۰۳ء میں جب عالمی مقابلہ حسن کے ججوں نے بکنی میں ملبوس مس افغانستان وِدا صمد زئی کی شرکت کا، عورتوں کی آزادی کے لیے ایک لمبی چھلانگ کی حیثیت سے، خیر مقدم کیا تو ہمارے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ تاہم صمد زئی کو ''حقوق نسواں کی فتح کی نمائندہ'' کے خصوصی انعام سے نوازا گیا۔''

اس کے بعد یہ برطانوی خاتون صحافی عورتوں کے سامنے دونوں طرز ہائے زندگی میں عورتوں کے مقام کا تعین کرنے والے پیمانوں کو رکھ ان سے کہتی ہے کہ وہ خود طے کریں کہ کون سا نظام ان کے لیے بہتر ہے۔ رڈلی کہتی ہیں:

''اب آپ کو خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ کو زیادہ آزادی دینے والا طریقہ کون سا ہے: آپ کے اسکرٹ کی لمبائی اور جراحی کے ذریعے بڑھائی گئی چھاتیوں کی بنیاد پر آپ کا پرکھا جانا یا آپ کی قدر و منزلت کا تعین آپ کے کردار اور فہم و فراست کی بنیاد پر کیا جانا؟ اسلام میں فضیلت کا پیمانہ اخلاقی حسن ہے نہ کہ جسمانی حسن، دولت، طاقت، منصب اور جنسی کشش۔''[۴]

مغرب میں عورت کو آزادی کے نام پر دھوکا دیا گیا

لارن بوتھ کی گواہی

لارن بوتھ (Lauren Booth) سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر کی خواہر نسبتی اور برطانیہ کی معروف صحافی ہیں۔ وہ ڈیلی میل، سنڈے ٹائمز، نیو اسٹیٹس مین اور سنڈے میل وغیرہ کے لیے لکھتی ہیں۔ بی بی سی اور اسکائی نیوز ٹی وی پر وہ باقاعدگی سے برطانوی اخبارات کا جائزہ بھی پیش کرتی

ہیں۔ لارن بوتھ نے ستمبر ۲۰۱۰ء میں ۴۳ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ ایران کے شہر قم میں بی بی فاطمہ معصومہؒ کے مزار کی زیارت کے دوران وہ ایک روحانی کیفیت سے گزریں جس کے بعد انہوں نے قبول اسلام کا حتمی فیصلہ کرلیا تاہم اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہونے کا آغاز اس سے کئی سال پہلے ہو چکا تھا جس کا ذکر ان کی مختلف تحریروں میں ملتا ہے۔ لارن بوتھ نے برطانوی اخبار ڈیلی میل میں "Why I Love Islam" کے عنوان سے یکم نومبر ۲۰۱۰ء کو شائع ہونے والے مضمون میں اپنے قبول اسلام کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ۵

وہ بتاتی ہیں کہ ۲۰۰۵ء میں جب وہ اپنے اخبار دی میل کی جانب سے فلسطینی انتخابات کی کوریج کے لیے پہلی بار مشرق وسطیٰ کے سفر کے لیے لندن سے روانہ ہوئیں تو ان کے دماغ میں مغربی میڈیا کے پروپیگنڈے کے زیر اثر ''انقلابی انتہا پسند، جنونی، جبری شادیاں، خودکش بمبار اور جہاد'' جیسے الفاظ گونج رہے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی انہیں عربوں یا مسلمانوں کے ساتھ وقت گزارنے کا کوئی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ان کے اس پہلے تجربے کے مثبت ہونے کے امکانات بہت کم تھے۔ تاہم جو واقعہ مسلمانوں اور اسلام کے لیے ان کے خیالات میں غیر محسوس طور پر مثبت تبدیلی کے آغاز کا سبب بنا اس کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے:

''میں مغربی کنارے پہنچی تو میرے بدن پر کوٹ بھی نہیں تھا کیونکہ اسرائیلی ائرپورٹ حکام نے میرا سوٹ کیس رکھ لیا تھا۔ رملہ کے مرکز میں گشت کرتے ہوئے میں سردی سے کانپ رہی تھی کہ ایک بوڑھی عورت نے میرا ہاتھ تھاما۔ عربی میں تیزی سے بولتے ہوئے وہ مجھے ایک قریبی گلی میں واقع اپنے گھر لے گئی۔ میں نے سوچا، کیا میں جوان کے بجائے ایک بوڑھی دہشت گرد کے ہاتھوں اغوا ہوگئی ہوں؟ ان پریشان کن لمحات کے دوران میں نے اُسے اپنی بیٹی کے وارڈ روب تک جاتا دیکھا یہاں تک کہ اس نے ایک کوٹ، ایک ہیٹ اور ایک اسکارف کھینچ نکالا۔ اس کے بعد مجھے اُس سڑک پر واپس لے آیا گیا جہاں میں گشت کررہی تھی، مجھے اس نے الوداعی بوسہ دیا اور پھر بڑی محبت کے ساتھ رخصت کردیا۔ اس عرصے میں ہمارے درمیان ایک بھی قابل فہم لفظ کا

تبادلہ نہیں ہوا۔ یہ شفقت و محبت کا ایسا برتاؤ تھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکی، اور پھر مختلف شکلوں میں سینکڑوں بار مجھے اس کا تجربہ ہوا۔ تاہم اِن گرمجوش رویوں کا ذکر ہمیں اپنے میڈیا کی خبروں میں بہت کم پڑھنے اور سننے کو ملتا ہے۔''

اپنی اسی تحریر میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی با حجاب مسلمان عورت کا مقابلہ کم لباس مغربی عورتوں سے کرتے ہوئے لارن بوتھ لکھتی ہیں:

''اس کے برعکس یورپ کی پروفیشنل عورتیں اپنے جسم کی زیادہ سے زیادہ نمائش کر کے خوش ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں خود اپنے بھورے بالوں اور یہی نہیں بلکہ اپنے سینے کے حسن پر فخر کیا کرتی تھی۔ اس کی ہمہ وقت نمائش کرنا عورتوں کے عام معمول کا حصہ ہے کیونکہ آج کے دور میں ہم جو کامیابیاں حاصل کرتے ہیں اس میں ہمارے جسم کی نمائش کا بڑا دخل ہوتا ہے۔''

لارن مغربی عورتوں کے اظہار حسن کے اس جنون کا حال بیان کرتے ہوئے سوال اٹھاتی ہیں کہ اگر عورت کی قدر و قیمت اس کی جسمانی و جنسی کشش ہی کی وجہ سے ہے تو کیا اسے آزادی کہا جا سکتا ہے؟

''حتیٰ کہ جب کبھی مجھے ٹیلی وژن پر کوئی پروگرام پیش کرنے کے لیے بلایا جاتا تو میں حیرت کے ساتھ بیٹھی دیکھا کرتی تھی کہ اس میں شرکت کرنے والی عورتیں، سنجیدہ موضوعات پر پندرہ منٹ سے بھی کم کی گفتگو سے پہلے اپنے بالوں کو سنوارنے اور اپنے میک اپ کو درست کرنے پر ایک ایک گھنٹہ صرف کرتی تھیں۔'' اس کے بعد لارن یہ نہایت اہم سوال اٹھاتی ہیں کہ ''کیا یہ آزادی ہے؟'' وہ کہتی ہیں: ''میں اب حیرت کے ساتھ سوچتی ہوں کہ ہمارے ''آزاد'' معاشرے میں لڑکیوں اور عورتوں کو کتنا حقیقی احترام حاصل ہے۔''

مسلم دنیا میں عورت کی بے چارگی کا تاثر درست نہیں

اسلامی ملکوں میں عورتوں کی بے چارگی اور مظلومیت کے پروپیگنڈے کو غلط قرار دیتے ہوئے مسلم دنیا میں اپنے مشاہدات کی روشنی میں لارن بوتھ حقیقت حال واضح کرتی ہیں۔ ڈیلی میل

کے اس مضمون میں وہ لبنان کے ایک سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میں ۲۰۰۷ء میں لبنان گئی۔ وہاں میں نے چار دن خواتین یونیورسٹی کی طالبات کے ساتھ گزارے۔ وہ سب کی سب مکمل طور پر باحجاب تھیں۔ان کا لباس بیلٹ والی قمیصوں اور پاجاموں یا جینز پر مشتمل تھا۔ان کے بال پوری طرح ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ دلکش، خودمختار، پراعتماد اور بے لاگ وصاف گو تھیں۔ وہ ہرگز غیر ضروری طور پر شرمیلی، بزدل، کم اعتماد اور جلد شادی پر مجبور کردی جانے والی ویسی بے بس لڑکیاں نہیں تھیں جیسا ہم مغرب میں اکثر ایسی باتیں پڑھنے اور سننے کی وجہ سے سمجھتے ہیں۔''

عورتوں پر ظلم کی وجہ کلچر ہے اسلام نہیں

ممتاز برطانوی اخبار گارجین میں تین نومبر ۲۰۱۰ء کو شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لارن بوتھ وضاحت کرتی ہیں کہ اسلام عورتوں کو تمام حقوق دیتا ہے اور مسلم ملکوں میں عورتوں پر جن زیادتیوں کا مغربی دنیا میں بہت ذکر ہوتا ہے وہ مختلف ملکوں میں رائج اسلام سے انحراف پر مبنی طور طریقے اور حکومتی قوانین ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ۔ وہ بتاتی ہیں کہ بالعموم مسلمان عورتیں پوری آزادی اور تمام حقوق کے ساتھ خاندانی زندگی گزارتی ہیں۔

اپنے قبول اسلام کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

''آیئے اب ہم سب ایک گہرا سانس لیں جس کے بعد میں آپ کو ایک دوسری دنیا کی کچھ جھلکیاں دکھلاؤں گی جو اکیسویں صدی میں اسلام کی دنیا ہے۔ بہت سے ملکوں اور کلچروں میں، جن میں اسلامی اور غیر اسلامی دونوں قسم کے معاشرے شامل ہیں، عورتیں مردوں کے ہاتھوں جس خوفناک بدسلوکی کا نشانہ بنتی ہیں، بلاشبہ ہم اس کی بدنمائی کو کم نہیں کر سکتے۔تاہم جو عورتیں اپنے مرد رشتہ داروں کی جانب سے بدسلوکی کا نشانہ بنتی ہیں، ان کے ساتھ یہ برتاؤ خدا نہیں، مرد کررہے ہیں۔''اسلامی'' ملکوں میں رائج بیشتر رویے اور قوانین ، ثقافتی اور روایتی رسوم و رواج پر مبنی ہیں، جو ان معاشروں میں داخل کردیے گئے ہیں۔مثال کے طور پر سعودی عرب میں عورتوں کو گاڑی چلانے

کی اجازت نہیں ہے۔ یہ قانون سعودی بادشاہت کی ایجاد ہے، جو اسلحہ اور تیل کی تجارت میں ہماری حکومتوں کی قریبی حلیف ہے۔'' اس تناظر میں مغرب کے حکمرانوں پر طنز کرتے ہوئے لارن کہتی ہیں ''عورتوں کے حقوق کی جنگ کو لازماً ہماری اپنی حکومتوں کی ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے۔''

عرب ملکوں میں مسلسل سفر کر کے انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس کی بناء پر بتاتی ہیں کہ مسلمان خواتین حجاب کے قوانین کی پابندی کرنے کے باوجود زندگی کے ہر میدان میں کسی دشواری کے بغیر سرگرم عمل ہیں اور کسی حق تلفی کا شکار نہیں ہیں۔ لکھتی ہیں:

''رملہ کے اپنے پہلے سفر، اور اس کے بعد فلسطین، مصر، اردن اور لبنان کے بہت سے دوروں میں میرا بااختیار مردوں سے ملنا جلنا رہا۔ اور پیارے قارئین، ان میں سے دو ایک تو ویسی خوفناک داڑھیوں والے بھی تھے، اپنی بمباری کے نتیجے میں جن کے پرخچے اڑتے، ہم اکثر دور دراز کے خبرناموں میں دیکھتے ہیں۔ ہر عمر کی ایسی بہت سی عورتوں سے بھی میرا ربط ضبط رہا جو سب کی سب سر ڈھانکتی تھیں اور بااختیار مناصب پر بھی فائز تھیں۔'' اپنے ان مشاہدات کے پیش نظر وہ اپنے مغربی قارئین سے کہتی ہیں ''آپ اس بات پر یقین کریں یا نہ کریں، مسلمان عورتیں تعلیم یافتہ ہوسکتی ہیں، ویسے ہی جان لیوا اوقات میں کام کرسکتی ہیں جن میں ہم کرتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے شوہر کو اس کے دوستوں کے سامنے غصہ بھرے لہجے میں حکم دے سکتی ہیں کہ وہ جا کر کھانا پکانے کا کام مکمل کرے یہاں تک کہ وہ اس مقصد کے لیے کمرے سے چلا جائے۔''

لارن کی بیٹیوں کا بے ساختہ اظہار مسرت

اسلام کی تعلیمات کس قدر فطری ہیں اور فطرت پر قائم ذہن کس طرح ان کا بے ساختہ خیر مقدم کرتا ہے، اس کا ایک دلچسپ اور چشم کشا مظاہرہ اس وقت ہوا جب لارن بوتھ نے اپنی بچیوں کو اپنے قبول اسلام کے بارے میں بتایا۔ اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لارن لکھتی ہیں:

''مجھ سے پوچھا گیا ہے: کیا میری بچیاں بھی مسلمان ہوجائیں گی؟ میں یہ بات نہیں جانتی

کیونکہ اس کا انحصار اُن کے اوپر ہے۔آپ کسی کا دل نہیں بدل سکتے۔لیکن ان کا رویہ یقینی طور پر مخالفانہ نہیں ہے،اور میرے تبدیلی مذہب کے اقدام پر ان کا ردعمل شاید سب سے زیادہ قابل ذکر چیز ہے۔''

لارن بتاتی ہیں کہ اپنی بچیوں کو یہ اطلاع دینے کے لیے وہ اپنے کچن میں بیٹھ گئیں اور بچیوں کو آواز دے کر وہاں بلالیا۔انہوں نے بچیوں سے کہا: ''میری بیٹیو، میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے، اور وہ یہ کہ میں مسلمان ہوگئی ہوں۔'' لارن کے بقول یہ بات سن کر وہ حیرت کے ساتھ ایک دوسرے سے چمٹ گئیں اور بڑی بچی ایلکس نے کہا'' ہمیں کچھ سوال کرنے ہیں، ہم ابھی واپس آتے ہیں۔'' لارن کہتی ہیں ''اس کے بعد انہوں نے ایک فہرست بنائی اور واپس آ گئیں۔ بڑی بیٹی ایلکس نے اپنا گلا صاف کیا اور بولی:

''کیا آپ اب بھی شراب پئیں گی؟ میرا جواب تھا: نہیں۔ بچیوں کا ردعمل حیرت آمیز اور مثبت تھا۔انہوں نے دوسرا سوال پوچھا: کیا آپ سگریٹ پئیں گی؟ سگریٹ حرام نہیں ہے مگر نقصان دہ ضرور ہے،اس لیے میں نے جواب دیا: نہیں۔اس پر بھی بچیوں کے رویے سے اطمینان کا اظہار ہوا۔تاہم ان کے آخری سوال نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔انہوں نے کہا: اب جبکہ آپ مسلمان ہوچکی ہیں تو کیا اب بھی آپ اپنا سینہ لوگوں کے سامنے نمایاں کریں گی؟''

لارن کہتی ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ میرا یہ طرز عمل انہیں شرمندگی میں مبتلا کرتا تھا چنانچہ انہوں نے اپنی بچیوں کے اس سوال کے جواب میں کہا ''اب جبکہ میں مسلمان ہوگئی ہوں، میں کبھی بھی اپنا سینہ لوگوں کے سامنے نمایاں نہیں کروں گی۔'' لارن کے مطابق اس پر بچیوں نے خوش ہوکر نعرہ لگایا ''ہم اسلام سے محبت کرتے ہیں'' اور کھیلنے کے لیے چلی گئیں۔'' لارن کی اس تحریر کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے ''اور میں بھی اسلام سے محبت کرتی ہوں''۔

نومسلم امریکی خواتین کے جذبات واحساسات: ایک تحقیقی مطالعہ

کیرل ایل اینوے (Carol L. Anway) امریکہ کی ایک خاتون ماہر تعلیم ہیں۔

Daghters of Another Path: Experiences of American Women Choosing Islam

(دخترانِ راہِ دیگر: اسلام کا انتخاب کرنے والی امریکی عورتوں کے تجربات)

امریکی عورتوں میں اسلام کی مقبولیت کے بڑھتے ہوئے رجحان پر اُن کی نہایت معلومات افزا کاوش ہے۔ اس کتاب کا محرک خود اُن کی بیٹی جوڈی کے قبول اسلام کا واقعہ بنا۔ اس کے بعدانہوں نے ایک ماں کی حیثیت سے ہمدردانہ طور پر جاننا چاہا کہ آخرامریکی عورتیں بڑے پیمانے پر اسلام کی جانب کیوں راغب ہورہی ہیں۔

دس ابواب پر مشتمل اس کتاب کے پہلے باب ''امریکہ میں عورتیں مسلمان ہورہی ہیں'' (Women Becomming Muslim In America) میں مصنفہ نے اپنے ذاتی حوالے سے کتاب کے محرکات اور پس منظر پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کتاب کی تیاری کے لیے ساڑھے تین سونو مسلم امریکی خواتین میں سوالنامے تقسیم کیے گئے۔ ان میں سے ۵۳ کی جانب سے مفصل جوابات موصول ہوئے۔ اوکلاہاما، کینساس، میسوری، ورجینیا، نیوجرسی، انڈیانا، اوریگن، الباما، ٹیکساس، کیلیفورنیا، لوزیانا، واشنگٹن، الی نوائے، پنسلوانیا، ارکنساس، وَرمونٹ، اور اونٹاریو کے علاقوں سے تعلق رکھنے والی اکیس سے لے کر ستاون برس تک کی ان ۵۳ عورتوں نے کیرل اینوے کے مطابق کئی گھنٹے صرف کر کے اس سوالنامے کا جواب بڑی توجہ اور محنت سے لکھا۔

ان میں گریجویشن سے لے کر ڈاکٹریٹ تک کی سطح کی خواتین شامل تھیں۔ سروے کے وقت ان میں سے ۴۰ فی صد اکیس سے تیس اور ۴۸ فی صد اکتیس سے چالیس سال تک کی تھیں۔

ان خواتین میں چھ ماہ سے تین سال قبل مسلمان ہونے والیوں کا تناسب ۳۲ فی صد اور چار سے چھ سال پہلے اسلام قبول کرنے والیوں کا ۲۴ فی صد تھا جبکہ سات سے دس سال پہلے مسلمان ہونے والی عورتوں کی شرح ۲۰ فی صد اور باقی ۲۴ فی صد کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی مدت گیارہ سے بائیس سال پر محیط تھی۔

ان نومسلم خواتین میں سے چالیس فی صد گھر سے باہر کل وقتی یا جز وقتی ملازت کرتی جبکہ بارہ فی صد کالج میں زیر تعلیم تھیں۔ تقریباً پچاس فی صد مکمل طور پر خانہ داری کرتی تھیں۔ ان میں

سے کم وبیش ۹۰ فی صد شادی شدہ اور ۷۵ فی صد بچوں والی تھیں۔

جہاں تک اسلامی احکام پر عمل کا تعلق ہے تو ان میں سے دو کے سوا سب ہمہ وقت احکام حجاب کی پابندی کرتی تھیں۔ جبکہ سوالنامے کے جوابات کے مطابق ان سب کی جانب سے روزانہ کی نمازوں اور رمضان کے روزوں نیز اسلامی تعلیمات کے مطالعہ کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ۱۸ فی صد نے بتایا کہ ان کے ہاں اسلامی طریقے سے ذبح کیے گئے گوشت کے علاوہ بھی گوشت کھایا جاتا ہے تاہم سور کا گوشت جس کی اسلام میں سخت ممانعت ہے، اس سے مکمل اجتناب کیا جاتا ہے۔

سروے میں شامل شادی شدہ خواتین نے بتایا کہ ان کی ازدواجی زندگی کامیاب اور خوشگوار ہے۔ کیرل اینوے کے مطابق ان خواتین کا کہنا تھا کہ اسلامی سیٹ اپ میں انہیں جو مقام حاصل ہے وہ اس سے بہت مطمئن ہیں۔ ان خواتین کے جوابات کی روشنی میں جو مجموعی نتیجہ مصنفہ نے اخذ کیا وہ یہ ہے:

''میڈیا میں اکثر سنائی جانے والی منفی کہانیوں کے برعکس ان خواتین کے جوابات سے واضح ہے کہ اسلامی طرز حیات کو اپنانے کے فیصلے پر ان کا ردعمل نہایت مثبت ہے .... اس مطالعے میں شامل بیشتر عورتیں اُس مخصوص طرز زندگی کو اپنانے کے فیصلے پر تکمیل اور مسرت کے احساس سے سرشار پائی گئیں جس کا نام ہے، اسلام۔''

امریکی نومسلمات ہم وطنوں کو حقائق سے آگاہ کرتی ہیں

کتاب کے دوسرے باب سے نویں باب تک ان نومسلم خواتین کی ابتدائی زندگی، عیسائی گھرانوں میں ان کی پیدائش اور پرورش، پھر ان کی جانب سے مسلمان ہونے کے فیصلے، اس پر والدین اور دوسرے رشتہ داروں اور احباب کے ردعمل، ان کے ساتھ روابط، اسلامی احکام پر عمل کے تجربے پر تاثرات، شادی، شوہر اور سسرالی عزیزوں سے تعلقات، اور امریکی معاشرے میں مسلمان بچوں کے احوال و معاملات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جبکہ دسویں اور آخری باب کا عنوان ہے:

The Daughters Speakout:

What Muslim Converts Would Like Us to Know

اس باب میں سروے میں شامل خواتین نے اسلام کے بارے میں اپنے تجربے کی روشنی میں اظہار خیال کیا ہے اور اپنے ہم وطنوں کی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے جو اسلام مخالف پروپیگنڈے کے نتیجے میں عام طور پر پائی جاتی ہیں، حقیقی صورت حال بیان کی ہے۔ اس باب سے چند اقتباسات ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ کتاب میں خواتین کے نام نہیں دیے گئے ہیں۔

- میں امریکی عوام کو بتانا چاہتی ہوں کہ ہم ان ہی جیسے لوگ ہیں۔ ہم اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے محنت مزدوری کرتے ہیں (ہم سب تیل کی دولت کے مالک نہیں ہیں)۔ ہم آنے والے دن کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں۔ ہم امن کے خواہش مند ہیں۔ بات بس اتنی ہے کہ ہمیں کچھ مذہبی عقائد پر یقین واثق حاصل ہوا اور اب ہم اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے شوہر نے مجھے یہ لباس پہننے پر مجبور نہیں کیا، میں مظلوم اور محکوم نہیں ہوں۔ میں فی الحقیقت اب آزاد ہوئی ہوں... میں اب فیشن، کپڑوں، بالوں، جوتوں اور ایسے ہی دوسرے فکر کے بندھنوں سے آزاد ہوں۔ مجھے اور میرے بچوں کو، قرض کی ادائیگی کے بعد، وراثت میں شرکت کی ضمانت دی گئی ہے۔ میں امریکہ اور امریکیوں سے نفرت نہیں کرتی۔ میں مسیح علیہ السلام سے اب بھی محبت کرتی ہوں اور اسی خدائے واحد کی عبادت کرتی ہوں جس کی بندگی کی تعلیم انہوں نے دی تھی۔ یہودیوں اور اسرائیل سے بھی میں نفرت نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں رہنے کی خواہش مند ہوں اگر مجھے یقین ہو کہ وہاں مجھ پر ظلم و تشدد نہیں کیا جائے گا۔ مجھے جس چیز سے نفرت ہے وہ ہے: بے انصافی، جھوٹ، بداعمالی، احکام الٰہی سے انحراف، تعصب، دانستہ اسقاط حمل، گوشت کا گدوانا، اور اللہ کی ہر نافرمانی کیونکہ میں خدا سے محبت کرتی ہوں۔ (ص: ۱۶۰-۱۶۱)
- میں نے اس راستے کا انتخاب اس لیے کیا ہے کیونکہ میں اسے پسند کرتی ہوں۔ میں نے کوئی ایسی چیز ترک نہیں کی جسے میں چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میری برین واشنگ نہیں کی گئی ہے۔ میں سوچنے سمجھنے کی مکمل اہلیت رکھنے والی تعلیم یافتہ عورت ہوں۔ میں اپنے ملک کی غدار نہیں

مگر عالمی سطح پر ایک نظریے کی حامی اور وکیل ضرور ہوں۔ میرا شوہر موجود ہو یا نہ ہو، میں ہمیشہ مسلمان رہوں گی۔ میں اپنے شوہر کی محبت کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوئی ہوں۔ میں اپنے بچوں کو بھی مسلمان کی حیثیت سے پروان چڑھانا چاہتی ہوں۔ میں امید رکھتی ہوں کہ وہ بھی مسلمان ہوں گے اور میری بیٹی حجاب کے اسلامی احکام پر عمل کرے گی۔ (ص:۱۶۰)

- واحد چیز جسے امریکیوں کو جاننا چاہیے میری رائے میں یہ ہے کہ اگر کوئی مرد یا عورت اسلام قبول کرتا ہے تو یہ اس لیے نہیں ہوتا کہ ہمیں اس پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو نماز پڑھنے، عربی سیکھنے، لمبی آستین کا لباس پہننے، بال ڈھکنے، یا اور کسی ایسے عمل پر مجبور نہیں کرسکتا جو ایک مسلمان کو لازماً کرنا چاہیے۔ ہم امریکی ہیں اور ہم دوسرے امریکیوں کی طرح اس نظریے کی حمایت کرنے اور اس کے لیے کام کرنے کا حق رکھتے ہیں جس پر ہمارا یقین ہے۔ (ص:۱۶۲)

- بعض لوگ جو اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانا چاہتے ہیں کہتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں سے دوسرے درجے کے شہریوں والا سلوک کیا جاتا ہے، یا یہ کہ اسلام میں عورت، مرد سے کمتر سمجھی جاتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے شوہر اور بچوں کو کھانا کھلائے اور پھر جو کچھ بچ رہے وہ خود کھائے۔ یہ بات حقیقت کو بھونڈے طریقے سے مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ بلاشبہ بعض اوقات عورتیں اپنے گھر کے دیگر افراد کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی ہیں لیکن یہ کوئی سزا یا ان کے عورت ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف کسی فیصلے کا نتیجہ نہیں۔ مسلمان عورت ایسا اپنی محبت اور احساس ذمہ داری کے تحت کرتی ہے۔ (ص:۱۶۳)

- میں محکوم و مجبور نہیں ہوں، مناسب لباس پہننے سے عورت کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ میں امریکہ کے لوگوں کو بتانا چاہوں گی کہ میرا شوہر کپڑے دھوتا ہے، گھر کی صفائی میں مدد کرتا ہے (حتیٰ کہ ٹوائلٹ باؤل کی صفائی بھی کرتا ہے)، اور بچوں کی دیکھ بھال میں تعاون کرتا ہے جس کی بناء پر میرا باہر جانا ممکن ہوتا ہے۔ بتایئے اس کے مقابلے میں نام نہاد آزادی یافتہ

عورت کا حال کیا ہے؟ مسلمان عورت شادی کے بعد اپنا نام نہیں بدلتی۔ ہمارے لیے اپنے شوہر کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنانا ضروری نہیں۔ ان شاء اللہ جب میری بیٹی کی شادی ہوگی تو اس کا نام پہلے کی طرح باقی رہے گا کیونکہ اسلام میں اس کی انفرادی حیثیت، ایک برابر کا مرتبہ رکھنے والے انسان کی حیثیت مسلّمہ ہے، اسے کسی خطِ الحاق کی ضرورت نہیں۔ (ص:۱۶۳)

• امریکہ میں سارے مسلمان غیر ملکی یا افریقی۔ امریکی نہیں ہوتے۔ اس ملک میں بہت سے گورے امریکی بھی مسلمان ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ آپ ایک ہی وقت میں گورے بھی ہو سکتے ہیں امریکی بھی اور مسلمان بھی۔ ہم عیسائی عورتوں یا کسی بھی مذہب اور قوم کی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ حقوق رکھتے ہیں۔ (ص:۱۶۴)

• مجھے ان مسلمانوں کو دیکھ کر نہ جانچیے جو اسلام کے نام پر خلاف اسلام کام کرتے ہیں۔ آپ مجھے براہ راست جاننے کی کوشش کیجیے۔ اسلام سے خوف زدہ نہ ہوں۔ مشرق وسطیٰ امور کے نام نہاد مغربی ماہرین کے مقالوں کے ذریعے اسلام کو جاننے کے بجائے ہم سے ان کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کیجیے جو حقیقی اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ میرے لباس کو دیکھ کر یہ نہ سمجھیے کہ اسے پہننے پر مجھے مجبور کیا گیا ہے۔ یہ وہی لباس ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی بیوی اور عیسیٰ علیہ السلام کی ماں کا تھا۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ ہمارے ورثے کا حصہ ہے۔ (ص:۱۶۴-۱۶۵)

• میں لوگوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں مظلوم اور مجبور نہیں ہوگئی ہوں۔ میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ اسلام عورتوں کو آزادی عطا کرتا ہے، اور یہ کہ میں اسی ایک خدا کی بندگی کرتی ہوں جو عیسائیوں اور یہودیوں کا خدا بھی ہے، اور یہ کہ سارے مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں۔ میری خواہش ہے کہ لوگ کھلے ذہن سے حقائق کو سمجھیں اور لاعلمی سے باہر آئیں۔ باحجاب عورتوں کا مذاق اڑانا بند کریں، یہ ان عورتوں کا حق ہے، اُن کے شوہروں یا باپوں نے انہیں اس پر مجبور نہیں کیا۔ آپ ہمیں امریکیوں کی حیثیت سے تسلیم کریں، خود بھی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ (ص:۱۶۶)

- ہم احمق نہیں ہیں، ہم نے اسلام اللہ کی غلامی کے لیے قبول کیا ہے، اپنے مَردوں کی غلامی کے لیے نہیں، اور ہم اپنے انتخاب پر خوش ہیں۔ (ص:۱۶۶)
- محض یہ بات کہ میں اپنا سر ڈھانکتی ہوں، مجھے کوئی عجوبہ، بنیاد پرست، کچلی ہوئی یا بے بس عورت، نہیں بناتی۔ (ص:۱۶۶)
- ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ بھی ہے کہ امریکہ میں رہنے والے تمام مسلمان مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھتے ہیں یا اس علاقے کے کسی فرد سے شادی کی وجہ سے مسلمان ہوئے ہیں۔ بات یہ نہیں ہے۔ یہاں ہزاروں ایسے امریکی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کے بارے میں دوسرے امریکی مسلمانوں سے آگہی پائی۔ میں اور میرے شوہر دونوں اس حقیقت کی ایک مثال ہیں۔ (ص:۱۶۶-۱۶۷)
- میری پوری زندگی میں سب سے خوشگوار واقعہ میرا مسلمان ہونا ہے۔ میرے مذہبی اور سیاسی نظریات بہت سے امریکیوں سے مختلف ہو سکتے ہیں، مگر میں امید کرتی ہوں کہ وہ اس حقیقت کو کھلے ذہن سے تسلیم کریں گے کہ ''اختلاف'' اور ''برائی'' ہمیشہ برابر نہیں ہوتے۔ مسلمان عورتیں (جنھیں اسلام کے تحت ان کے حقوق دیے گئے ہیں) وہ نہ اپنے گھروں کے اندر زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں، نہ انہیں مارا پیٹا اور ٹارچر کیا جاتا ہے۔ ہم اسی معاشرے کا حصہ ہیں، اور ایک انتہائی اہم مقصد رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا ''قومیں ماؤں کی گودوں میں پروان چڑھتی ہیں''۔ ہمارے سامنے کرنے کا ایک بہت اہم کام ہے۔ مجھے امید ہے کہ امریکی عوام اس کام کی اہمیت کو گھٹانے سے اجتناب کریں گے۔ (ص:۱۶۷)
- امریکیوں کو سمجھنا چاہیے کہ مسلمان صرف اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ وہ اپنی زندگیاں اللہ کی رضا کے مطابق گزار سکیں۔ ہمارا دین بہت غلط سمجھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارا دین دنیا میں سب سے زیادہ تیز رفتاری سے پھیلنے والا مذہب بھی ہے۔ دس سال میں اسلام ان شاء اللہ امریکہ کا دوسرا بڑا مذہب ہوگا۔ امریکی عیسائیت سے اسلام کی طرف کیوں آرہے

ہیں؟ امریکیوں کو گھسے پٹے خیالات کو ترک کر کے حقیقی اسلام سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے، جو امن کا مذہب ہے اور جس کے ماننے والے ہر روز زیادہ سے زیادہ بڑھ رہے ہیں۔ اسلامی معاشرے سے وابستگی کا مطلب جنونی یا تشدد پسند بن جانا نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس کا مطلب ایسی جمعیت سے رشتہ جوڑنا ہے جس کے وابستگان اللہ کے بتائے ہوئے اخلاقی ضابطوں نیز مذہبی فرائض اور سماجی قوانین پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اسلام ہماری پوری زندگی پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ تمام زمانوں اور تمام لوگوں کے لیے ہے۔ اگر امریکی اسلام کو قریب سے دیکھیں اور اس سے آگہی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو اسے یقیناً سمجھ سکتے ہیں۔ (ص:۱۶۷)

- اسلام عورتوں کے لیے کوئی قید خانہ نہیں جیسا کہ امریکہ میں برسوں سے سمجھا جاتا ہے۔ ہر شائستہ اور مہذب معاشرے کی طرح اسلام بھی معقول رہنما خطوط اور قوانین رکھتا ہے، تاہم اسلام میں لچک ہے جبکہ بعض دوسرے قوانین ''پتھر کی تحریر'' اور ان میں کسی بھی صورت کوئی رعایت ممکن نہیں۔ (ص:۱۶۸)

- میری خواہش ہے کہ امریکی عوام اس حقیقت کو سمجھیں کہ مسلمان عورتیں دوسرے درجے کی شہری نہیں ہوتیں۔ ہم اپنے شوہروں کے پیچھے نہیں گھومتے۔ ہمیں ناقابل تنسیخ حقوق حاصل ہیں۔ اسلام کوئی انتہا پسندی کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام ہمیشہ اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کوئی عرب، یا افریقی۔ امریکی چیز نہیں۔ یہ دین تمام انسانوں اور تمام قوموں کے لیے ہے۔ اسلام امن اور حقیقی خوشی کا مذہب ہے۔ (ص:۱۶۸)

- اگر آپ کبھی یہ جان سکیں کہ اسلام فی الحقیقت کیا ہے، تو آپ فوراً ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ فی الحال یہ کہیں مکمل طور پر نافذ نہیں ہے اور ہمارے ذہنوں میں اس کا محض تصور ہے۔ اسلام میں شادی کے بندھن کو تحفظ دیا گیا ہے اور صنفی معاملات پردے میں رکھے گئے ہیں۔ یہ بندوبست ہمارے گلی کوچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ہے۔ یہ نظام قائم ہو تو آپ کے بچے جنسی بے راہ روی اور منشیات کی لعنت کا شکار نہیں ہوں گے۔ وہ اقدار پر مبنی تعلیم پائیں گے اور عملی

مہارت حاصل کریں گے۔آپ کے شوہر کی آمدنی خاندان کی کفالت کے لیے کافی ہوگی اور آپ آزاد ہوں گی کہ چاہیں تو کام کریں ورنہ تعداد پر کسی پابندی کے بغیر بچوں کی آرزو پوری کریں اور ان کی دیکھ بھال کریں ، یا تعلیم کے حصول اور دوسرے طریقوں سے زندگی میں آگے بڑھیں۔اسلام عملی شکل میں نافذ ہو تو لوگوں کو بے روزگار ہونے یا رہن رکھی جائیداد کے ضبط ہو جانے کا خوف نہیں ہوگا۔معیشت چھوٹے پیمانے پر مقامی کاروبار اور سود سے پاک بینک کاری نظام پر استوار ہوگی اور زندگی دوبارہ قابل برداشت ہو جائے گی۔(ص:۱۶۸)

- اسلام ایک نظام زندگی ہے۔اس میں زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔میں نے بحیثیت طریقِ زندگی اسلام کا انتخاب اپنی آزاد مرضی سے کیا، کسی کے دباؤ کی وجہ سے یا اپنے شوہر کی خاطر نہیں۔ مجھے اسلام سے محبت ہے اور میں محسوس کرتی ہوں کہ میں جب پیدا ہوئی تو مسلمان تھی مگر میری پرورش عیسائی کی حیثیت سے کی گئی۔اس لیے میں اب سچے اور سیدھے راستے کی طرف لوٹ آئی ہوں، میں نے راستہ بدلا نہیں ہے۔(ص:۱۶۹)
- بحیثیت مسلمان عورت میں کہنا چاہوں گی کہ اسلام نے مجھے کئی طرح سے آزادی عطا کی ہے۔بیشتر امریکی مسلمان عورتوں کو مجبور و مظلوم سمجھتے ہیں،لیکن میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ اگر مسلمان عورتیں کسی معاشرے میں مظلوم ہیں تو اس کی وجہ اصل اسلام کو چھوڑ دینا اور اپنے ملک کے رسوم و رواج پر عمل کرنا ہے۔اسلام اس سارے کوڑے کرکٹ کو دور پھینک دیتا ہے جو عورتوں کو پستی میں دھکیلنے کا سبب ہے اور انہیں عزت نفس اور خود اعتمادی کے بلند مرتبے پر فائز کرتا ہے۔ اکثر امریکی عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کرۂ ارض پر سب سے زیادہ آزادی یافتہ عورتیں ہیں تاہم وہ محکومی و مجبوری کے بندھنوں سے حقیقتاً نجات حاصل نہیں کرسکی ہیں۔ہر وہ عورت جسے مسترد کر دیے جانے کے خوف سے اپنے جسم کو پرکشش بنائے رکھنا پڑتا ہو، ہر وہ عورت جسے ''توجہ'' حاصل کرنے کے لیے اپنے بدن کی نمائش کرنی پڑتی ہو، ہر وہ عورت جسے اپنے مرد ساتھی کے مقابلے میں یکساں کام کا کم معاوضہ ملتا ہو، ایسی تمام عورتیں اب بھی ظلم کا شکار ہیں۔اور صورت حال سے نجات پانے

کا واحد طریقہ ان زنجیروں کو توڑ کر اپنی زندگی میں اللہ اور اسلام کو قبول کر لینا ہے۔ (ص:۱۶۹)

- امریکی مسلمان عورت مظلوم نہیں ہے۔ حجاب ہمارا حق ہے، سزا نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی طرز زندگی ہم سے آگے نہیں' ایک قدم پیچھے ہے۔ مشرق وسطیٰ کی عورتیں امریکی طرز زندگی کی نام نہاد شان وشوکت کو حسرت سے دیکھ سکتی ہیں کیونکہ ان کے ملکوں میں مقامی طور طریقوں پر عمل کیا جاتا ہے، اسلام پر نہیں۔ اگر میری مشرقی بہنوں کے ملکوں میں اسلام پر فی الواقع عمل ہو رہا ہوتا تو آج مغرب کی عورتیں اسلامی حقوق کے لیے لڑ رہی ہوتیں۔ (ص:۱۶۹)

مغربی عورتوں کے قبول اسلام کے اسباب
کرسچین سائنس مانیٹر کی تجزیاتی رپورٹ

مغرب میں قبول اسلام کے بڑھتے ہوئے رجحان اور اسلام سے عورتوں کی خصوصی دلچسپی کے بارے میں عالمی ذرائع ابلاغ میں وقتاً فوقتاً خبریں اور تجزیے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک تجزیاتی رپورٹ ممتاز امریکی اخبار کرسچین سائنس مانیٹر کے ۲۷ دسمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شامل کی گئی جس کا عنوان ہے: ''وائی یورپین ویمن آر ٹرننگ ٹو اسلام؟'' (یورپی عورتیں اسلام کی جانب کیوں مائل ہو رہی ہیں؟)

کرسچین سائنس مانیٹر کے اسٹاف رائٹر پیٹر فورڈ کی مرتب کردہ اس رپورٹ کے مطابق:

''مسلم اور غیر مسلم تحقیق کار دونوں کہتے ہیں کہ نائن الیون کے بعد اسلام کے بارے میں اُبھرنے والے تجسس کی بناء پر اسلام کا پیغام زیادہ سے زیادہ یورپی باشندوں کو اپیل کرنے کا باعث بن گیا ہے۔ متعین اعداد وشمار تو دستیاب نہیں مگر یورپ میں مسلمانوں کی آبادی پر نظر رکھنے والے مبصرین کا اندازہ ہے کہ ہر سال کئی ہزار مرد اور خواتین اسلام قبول کرتے ہیں۔ یہ محققین نشان دہی کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے والوں میں سے ایک بہت ہی چھوٹا سا حصہ اسلام کے ریڈیکل تصور کی طرف مائل ہوتا ہے اور ان میں سے بھی بمشکل چند تشدد کا راستہ اپناتے ہیں۔ جبکہ اب تک محض مٹھی بھر نو مسلم دہشت گرد کارروائیوں کے مجرم ٹھہرے ہیں۔''

مؤقر امریکی جریدے کے اخذ کردہ یہ نتائج اس امر کا کھلا اعلان اور اعتراف ہیں کہ اسلام کو دہشت گردی کا مبلغ قرار دینا قطعی بد دیانتی ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

اخبار لکھتا ہے: ''اگر چہ مردوں کے مقابلے میں قبول اسلام کا رجحان عورتوں میں زیادہ ہے لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ عام خیال کے برعکس اس کا سبب مسلمان مردوں سے شادی نہیں اور بہت کم ہی عورتیں اس بناء پر اسلام قبول کرتی ہیں۔'' رپورٹ کے مطابق، قبولِ اسلام میں شادی کے کردار کے حوالے سے برمنگھم یونیورسٹی کی معلّمہ ڈاکٹر حیفہ جواد کا کہنا ہے کہ ''ماضی میں اگر چہ یہ ایک عمومی سبب تھا مگر اب زیادہ تر عورتیں اپنے یقین کی بنیاد پر مسلمان ہو رہی ہیں۔''

رپورٹ میں ایک فرانسیسی نومسلمہ کے قبول اسلام کے اسباب اس کی اپنی زبانی یوں تحریر کیے گئے ہیں:

''مسلمان ہونے والی ہزاروں یورپی خواتین میں سے ایک فرانس کی مس میری فیلوٹ بھی ہے۔ وہ تین سال پہلے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئی تھی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا اس کی محبت اس کے اس فیصلے کا سبب بنی ہے؟ تو اس نے ہنستے ہوئے کہا ''جب میں نے اپنے دفتر کے ساتھیوں کو بتایا کہ میں مسلمان ہوگئی ہوں تو ان کا پہلا سوال یہی تھا کہ کیا تمہارا کوئی مسلمان بوائے فرینڈ ہے؟ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ فیصلہ میں نے اپنی آزاد مرضی سے کیا ہے۔'' مس فیلوٹ کے بقول اسلام کا راستہ اُس نے اِس لیے اپنایا ہے کیونکہ:

''اسلام اللہ تعالیٰ سے انسان کی قربت چاہتا ہے۔ اسلام زیادہ سادہ اور مکمل ہے۔ زیادہ صاف اور واضح ہے، اس لیے زیادہ آسان بھی ہے۔'' اس نوعمر فرانسیسی نومسلمہ نے اپنے قبول اسلام کے اسباب کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''مجھے زندگی بسر کرنے کے لیے ایک لائحۂ عمل کی تلاش تھی۔ ہر انسان کو ایسے ضوابط اور رویوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے مطابق وہ زندگی گزار سکے جبکہ عیسائیت مجھے ایسے ریفرنس پوائنٹس نہیں دے سکی۔'' میری فیلوٹ کا کہنا ہے کہ ''اسلام میرے لیے محبت، برداشت اور امن کا پیغام ہے''۔

پیٹر فورڈ محققین کے حوالے سے کہتے ہیں کہ یہ وہ دلائل اور اسباب ہیں جو اسلام قبول کرنے والی بیشتر یورپی خواتین کے اندازِ فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق عورتوں کی ایک بڑی تعداد مغربی معاشرے کی اخلاقی غیریقینی اور غیر ذمہ دارانہ رویوں کے خلاف ردِعمل کا اظہار کررہی ہے۔ باہمی وابستگی و تعلق، ایک دوسرے کا خیال رکھنے اور ایک دوسرے کے معاملات اور مسائل میں شرکت کا جو شعور اسلام دیتا ہے، وہ مغرب کی عورتوں کے دل جیت رہا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ڈچ خواتین کے قبولِ اسلام پر ریسرچ کرنے والی کیرین وین نیووکرک کے نزدیک مغربی عورتوں میں اسلام کی مقبولیت کا بڑا سبب ''مردوں اور عورتوں کے الگ الگ دائرۂ کار اور حقوق و فرائض کا وہ واضح تصور ہے جو اسلامی تعلیمات فراہم کرتی ہیں۔ اسلام میں خاندان اور عورت کے مادرانہ کردار کا بڑا مقام ہے، یہاں عورتیں جنسی کھلونا نہیں ہوتیں۔''

کیرین وین نیووکرک، جن کی تالیف ''ویمن امبریسنگ اسلام'' کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے، اُن کی یہ رائے یقیناً بڑی اہمیت کی حامل اور انتہائی قابل توجہ ہے کیونکہ اسلام عورتوں کو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے جو عزت اور احترام دیتا ہے مغربی معاشروں میں اس کا کوئی تصور نہیں۔ اس جنس زدہ تہذیب میں عورتوں کے حقوق اور آزادیٔ نسواں کے تمام دعووں کے باوجود عورت محض مردوں کا کھلونا ہے اور پچھلے صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام قبول کرنے والی مغربی خواتین اس حقیقت کا کس طرح کھل کر اظہار کرتی ہیں۔ مادّہ پرست معاشروں میں ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ جب روحانی زندگی اور آخرت کی کامیابی کا اعلیٰ نصب العین انسان کے پیش نظر ہی نہ رہے اور اس کی ساری تگ و دَو کا مقصد صرف حصول لذت ہو تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نکل ہی نہیں سکتا۔

مسلم اور غیر مسلم معاشرے کے رویوں کے اس فرق کو واضح کرتے ہوئے نیو جرسی میں رہنے والی لاطینی امریکن نومسلمہ جیسمین پائی نیٹ کہتی ہیں: ''مسلمان مرد آپ کو 'ہائے میمی، تم کیسی ہو؟' کے الفاظ سے مخاطب نہیں کرتے بلکہ عام طور پر 'ہیلو سسٹر' کہتے ہیں۔ وہ آپ کو ایک جنسی

کھلونا سمجھ کر نہیں گھورتے۔'' یہ اقتباس کرسچین سائنس مانیٹر کی ایک اور رپورٹ سے لیا گیا ہے جو ۲۷ دسمبر ۲۰۰۴ء کو ''لاطینی امریکی اسلام میں اپنے سوالوں کا جواب ڈھونڈتے ہیں'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

کرسٹائن آرمیریو کی مرتب کردہ اس رپورٹ کا بنیادی موضوع ہی یہ ہے کہ مغرب میں قبول اسلام کے روزافزوں رجحان کا ایک اہم سبب وہ احترام ہے جو اسلام عورت کو عطا کرتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق امریکہ میں تقریباً چالیس ہزار لاطینی امریکی نومسلم ہیں جبکہ ہر سال تقریباً بیس ہزار امریکی مرد وخواتین اسلام قبول کرتے ہیں جن میں کم وبیش چھ فی صد لاطینی امریکی ہوتے ہیں۔ ان نومسلموں میں سے ایک بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ ان کے قبول اسلام میں اس یقین واعتماد نے اہم کردار ادا کیا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔ تنقید کرنے والے کہہ سکتے ہیں کہ نقاب کی پابندی عورتوں کے ملکیت ہونے کی علامت محسوس ہوتی ہے لیکن کئی نو مسلم لاطینی خواتین کا کہنا ہے کہ ان کے لیے یہ ایک خوشگوار حقیقت ہے کہ جب وہ راستے میں ہوتی ہیں تو کوئی انہیں دیکھ کر سیٹی نہیں بجاتا۔ جینی یانیز، جو ہزاروں لاطینی نومسلم خواتین میں شامل ہیں، کہتی ہیں کہ اسلامی لباس کے نتیجے میں ''لوگ فطری طور پر مجھے ایک مذہبی شخصیت کا سا اعزاز دیتے اور احترام کرتے ہیں۔''

تاہم اپنی تہذیب اور معاشرے سے بغاوت کا یہ عمل اپنے ساتھ مشکلات بھی لاتا ہے۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے والی خواتین کو اپنے والدین اور عزیزوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ نومسلم خواتین کے نزدیک اس کا سبب اسلام میں خواتین کے مقام کے حوالے سے پھیلائی گئی غلط فہمیاں ہیں۔ زیرنظر رپورٹ کے مطابق مسلمان ہوجانے والی کئی لاطینی امریکی خواتین نے بتایا کہ پہلے وہ اسلام میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے ان ہی گھسی پٹی باتوں سے واقف تھیں جو مغرب میں عام ہیں۔ لیکن جب مسلمانوں سے ان کا میل جول ہوا تو انہیں پتہ چلا کہ اسلامی معاشرے میں عورت کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ مس پائی نیٹ کے بقول ''اسلامی

معاشرے میں عورت کا احترام اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ ماں ہے، وہ بچوں کی پرورش ونگہداشت کرتی ہے، اور اصول وضوابط پر عمل کراتی ہے۔"

مغربی عورت بمقابلہ مسلمان عورت: ایک موازنہ

مغرب میں جہاں غیر یورپین تہذیبوں خصوصاً اسلامی تہذیب کے بارے میں علمی اور دانشورانہ سطح پر منفی سوچ اور رجحانات پائے جاتے ہیں، وہاں اس کے برعکس خیالات رکھنے والے اور مغرب کی سوچ اور اقدار پر تنقید کرنے والے دانش ور بھی موجود ہیں۔ سوئس نژاد کینیڈین ڈاکٹر میکاؤ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے ٹورنٹو یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔ گزشتہ عشرے میں ان کی چار تصانیف منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کا ایک نہایت چشم کشا مضمون "Burka Vs Bikini - The Debauchery Of American Womanhood" (برقعہ بمقابلہ بکنی: امریکی نسائیت کی دُرگت) کے عنوان سے ستمبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا تھا جسے بڑی مقبولیت ملی اور وہ متعدد ویب سائٹوں اور جرائد کی زینت بنا۔ انہوں نے اسے ۲۴ ستمبر ۲۰۰۹ء کو اپ ڈیٹ کیا ہے اور اب یہ Bikini vs. Burka: The Debauchery of Women کے عنوان سے ان کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔[۶]

ہنری میکاؤ اپنی اس تحریر کا آغاز یوں کرتے ہیں:

"اپنے کمرے کی دیوار پر میں نے دو تصویریں لگا رکھی ہیں، ان میں سے ایک تصویر برقعے میں ڈھکی ایک مسلمان عورت کی ہے اور دوسری تصویر مقابلہ حسن کی شریک ایک امریکی عورت کی ہے جس کے بدن پر ایک بکنی کے سوا کچھ نہیں۔"

"ان میں سے ایک عورت لوگوں کی نگاہوں سے پوری طرح چھپی ہوئی ہے جبکہ دوسری ان کے سامنے مکمل طور پر عیاں ہے۔ یہ دو انتہائیں نام نہاد تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں بہت کچھ بتا رہی ہیں۔"

اس کے بعد مسلم دنیا میں مغربی حکمرانوں کی حالیہ پالیسیوں کے اصل مقاصد سے پردہ

اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عورت کا کردار کسی بھی ثقافت کا دل ہے۔مشرق وسطیٰ پر مسلط کی گئی جنگ ،عربوں کا تیل چرانے کے علاوہ برقعے کو بکنی سے بدل کر، ان کے بدن سے ان کے مذہب اور ان کی ثقافت کا لباس اتار دینے کے لیے بھی ہے۔''

معاشرے کی اخلاقی تعمیر میں برقعہ کیا کردار ادا کرتا ہے، اس بارے میں ڈاکٹر میکا وَ اپنا نقطہ نظر یوں پیش کرتے ہیں:

''میری نگاہ میں برقعہ شوہر اور اپنے اہل خانہ کے لیے عورت کی تخصیص اور تقدیس کی علامت ہے۔ اس طرح ایک عورت کے اہل خانہ ہی اُسے دیکھتے ہیں۔ برقعہ گھریلو زندگی کی رازداری اور اہمیت کو مستحکم کرتا ہے۔''

عورت کو شمع محفل کے بجائے چراغ خانہ بنانے کی اسلامی تعلیم کی حکمتوں کا اعتراف ڈاکٹر میکا وَ کی اس تحریر میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''مسلمان عورت کی سرگرمیوں کا محور اس کا گھر ہے۔ یہ وہ آشیانہ ہے جہاں اس کے بچے جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ وہ ''گھر'' بنانے والی ہے۔ یہ گھر خاندان کی روحانی زندگی کو سیراب کرنے والا سرچشمہ ہے۔اس کے بچوں کی پرورش اور تربیت کا مرکز ہے اور اس کے شوہر کی تقویت کا باعث اور پناہ گاہ ہے۔''

مغربی تہذیب کے زیر اثر عورت کو گھر سے باہر نکال کر چوکوں اور چوراہوں کی زینت بنانے کے جو عبرت ناک نتائج اس کی حرمت اور تقدیس پر مرتب ہوئے ہیں، ان کا نقشہ ڈاکٹر میکا وَ نے نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ اس طرح کھینچا ہے:

''اس کے برعکس بکنی پوش امریکن بیوٹی کوئین ٹی وی پر عملاً عریاں حالت میں لاکھوں لوگوں کے سامنے اِتراتی ہوئی آتی ہے۔ اپنی حد تک وہ عورتوں کے حقوق کی علم بردار اور اپنی مالک آپ ہے مگر عملاً وہ پبلک پراپرٹی ہے۔ وہ کسی کی نہیں اور سب کی ہے۔ وہ اپنے جسم کو سب سے زیادہ بولی

لگانے والے کے ہاتھ فروخت کرتی ہے۔وہ خود کو ہمہ وقت نیلام کرتی رہتی ہے۔امریکہ میں عورت کی سماجی و ثقافتی حیثیت کا پیمانہ اس کی صنفی کشش ہے۔(یہ اثاثہ کیونکہ تیزی سے فرسودگی کا شکار ہوتا اور اپنی قیمت کھوتا ہے اس لیے وہ اعصابی امراض میں مبتلا نظر آتی ہے اور وزن بڑھنے کے مسائل سے دوچار ہے)''۔

اس طرز زندگی کے نتیجے میں مغربی تہذیب میں عورت کی نسائیت کا قیمتی جوہر کس طرح برباد ہوتا ہے، ڈاکٹر میکاؤ اس کے چند اہم پہلوؤں پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''نوعمری میں اس کے لیے قابل تقلید نمونہ برٹنی اسپیئرس جیسی گلوکارہ ہوتی ہے جس کا فن یکے بعد دیگرے کپڑے اتار کر تماشائیوں کو محظوظ کرنے سے ملتا جلتا ہے۔برٹنی سے وہ یہ سیکھتی ہے کہ اسے محبت صرف اس صورت میں ملے گی جب وہ مردوں کے لیے جنسی جذبے کی تسکین کا ذریعہ بنے۔اس طرح وہ مخلصانہ باہمی تعارف، محبت اور شادی کا مطالبہ کرنے کے بجائے بددیانتی پرمبنی خفیہ جنسی تعلقات قائم کرنا سیکھتی ہے۔نتیجتاً اس کے شوہر سے پہلے ہی درجنوں مرد اس سے آشنا ہو چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی معصومیت کھو بیٹھتی ہے جو اس کی شخصیت کی دلکشی اور جاذبیت کا اہم جزو ہے۔وہ سخت دل اور خودغرض بن کر محبت کرنے کی اہلیت سے محروم ہو جاتی ہے اور اپنے شوہر کے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے قابل بھی نہیں رہتی۔''

عورت کے لیے ماں کے فطری کردار کی اہمیت اور مرد و عورت کے مزاج میں رکھے گئے قدرتی فرق کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر ہنری میکاؤ لکھتے ہیں:

''عورت کی شخصیت ماں اور بچے کے باہمی جذباتی تعلق پر استوار کی گئی ہے۔اس کی بنیاد ایثار و قربانی اور پیار و محبت پر رکھی گئی ہے۔مردانہ فطرت شکار اور شکاری کے باہمی تعلق پر مبنی ہے۔یہ جفاکشی اور دلیل و برہان کی اساس پر تشکیل دی گئی ہے۔''

آزادی نسواں کی تحریک دراصل نسوانیت کی موت کے مترادف ہے، اس اہم حقیقت کو ڈاکٹر میکاؤ نے یوں نمایاں کیا ہے:

’’ آزادیِ نسواں کی تحریک عورتوں کو اس دھوکے میں مبتلا کرتی ہے کہ نسوانیت کا نتیجہ مظلومیت کی شکل میں نکلا ہے، اس لیے انہیں اس کے بجائے مردانہ رویہ اپنانا چاہیے۔ اس فکر کے نتیجے میں ایک الجھی ہوئی اور جارحیت پر آمادہ عورت سامنے آئی ہے جس کے کاندھوں پر بھاری بوجھ ہے اور جو نہ بیوی بننے کے لائق ہے نہ ماں۔‘‘

ڈاکٹر میکاؤ کا اخذ کردہ یہ نتیجہ ٹھیک وہی بات ہے جس کی نشان دہی حکیم مشرق علامہ اقبال آج سے کم وبیش پون صدی پہلے یوں کر گئے تھے:

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

اور یہ کہ

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو ارباب نظر موت

ڈاکٹر میکاؤ اس صورت حال کے پیچھے کارفرما ذہن کو بے نقاب کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

’’درحقیقت نئے عالمی نظام کے سماجی انجینئروں کو جو نتیجہ مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ صنفی شناخت کو بے اعتمادی اور کمزوری سے دوچار کر کے خاندانی نظام کو تباہ کر دیا جائے، معاشرتی اور شخصی سطح پر تعطل پیدا کیا جائے اور ’’نئی بہادر دنیا‘‘ میں آبادی کم کی جائے۔ اس فلسفے کے مطابق عورتوں کو ماں اور افزائش نسل کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ اس کے بجائے انہیں اپنے صنفی خواص سے محروم، جنسی جذبے کی تکمیل کا ایک خود مختار ذریعہ ہونا چاہیے۔‘‘

مغربی عورت آزادی کے جس فریب میں مبتلا کی گئی ہے، اور مسلم ملکوں میں اسی بہانے عالمی استعماری طاقتیں جس طرح اپنے مفادات کا کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہی ہیں، ڈاکٹر میکاؤ اسے یوں سامنے لاتے ہیں:

’’عورتوں کی آزادی کو اکثر افغانستان کے خلاف جنگ کے جواز کے طور پر پیش کیا جاتا

ہے۔ انہیں کس چیز کی آزادی دلانا مقصود ہے؟ برٹنی اسپئیر بننے کی؟ عریاں جسم کی نمائش کرنے کی؟ باہمی ماسٹربیشن کی جو جنسی لذت اندوزی کے لیے امریکہ میں عام ہے؟...... حقیقت یہ ہے کہ اگر انہیں واقعی عورتوں کی فکر ہوتی تو وہ جنگ ختم کر چکے ہوتے۔''

مرد اور عورت کو بحیثیت والدین معاشرے میں اپنے فطری کردار کی ادائیگی سے روکنے اور اس طرح انسانیت کو برباد کرنے کے لیے اس دور میں جو ہتھکنڈے شیطان کے کارندے استعمال کرر ہے ہیں، ڈاکٹر میکاؤان کے بارے میں بھی بتاتے ہیں:

''انسانی نشو ونما میں ماں باپ کا کردار سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب ہم بالآخر ذاتی اغراض سے بالاتر ہو کر ایک نئی زندگی کو وجود میں لانے اور پروان چڑھانے کی ذمہ داری سنبھال کر خدا کے قائم مقام بن جاتے ہیں۔ نیا عالمی نظام نہیں چاہتا کہ ہم بلوغت کے اس مقام تک پہنچیں۔ لہٰذا پورنوگرافی کو شادی کا متبادل بنا دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مرد اور عورت الگ الگ، اپنی تکمیل سے محروم، جنسی بھوک کا شکار اور اپنی ذات کے خول میں بند رہیں۔''

عورت کی آزادی اور خودمختاری کے نام پر جو کچھ اس کے نام نہاد ہمدرد کرر ہے ہیں، انسانی معاشرے خصوصاً عورتوں پر مرتب ہونے والے اس کے عملی نتائج کی وضاحت مصنف یوں کرتے ہیں:

''وہ ہمیں مستقل نجی زندگی کی سہولت نہیں دینا چاہتے، وہ ہمیں اکیلا اور الگ تھلگ، دائمی کورٹ شپ کی کیفیت کے اندر اور اپنی شناخت کے لیے صارفین کی مصنوعات کا محتاج رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ چیز عورت کے لیے خاص طور پر تباہ کن ہے۔ اس کی صنفی کشش اس کی بارآوری کی صلاحیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس صلاحیت کے کم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی صنفی کشش بھی زوال پذیر ہوتی جاتی ہے۔ اگر ایک عورت اپنے ابتدائی برسوں کو ''خودمختار'' بننے میں لگا دے تو شاید وہ اپنے لیے مستقل ساتھی تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی دیرپا مسرت اور تشفی کا سامان شادی کرنے اور گھر بسانے کو اولین ترجیح قرار دینے میں ہے۔''

آزادیٔ نسواں کی مغربی تحریک پر مصنف کا مجموعی تبصرہ یہ ہے:

''نسوانیت کی تحریک نئے عالمی نظام کا ایک ظالمانہ فریب ہے جس نے امریکی عورتوں کو اخلاق باختگی میں مبتلا کیا اور مغربی تہذیب کو تباہ کر دیا ہے۔''

آزادیِ نسواں کی مغربی تحریک کے نتیجے میں عورت جس ذلت و پستی کا شکار ہوئی ہے، اس کے مقابلے میں ڈاکٹر میکاؤ کے بقول حجاب کا طریقہ عورتوں کی عزت اور وقار اور خاندان کے تحفظ اور سلامتی کا ضامن ہے، وہ کہتے ہیں:

''میں برقعے کی نہیں بلکہ بعض اُن اقدار کی حمایت کر رہا ہوں جن کی یہ نمائندگی کرتا ہے، بالخصوص اپنے ہونے والے شوہر اور خاندان کے لیے ایک عورت کی حرمت و تقدیس، عفت و پاکیزگی اور عزت و وقار جو اس سے وابستہ ہے۔''[۷]

مغربی خواتین میں اسلام کی مقبولیت کے اصل اسباب کیا ہیں؟ اس باب میں مغربی تحقیق کاروں اور خود اسلام قبول کرنے والی خواتین کے خیالات کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، اور یہ حیرت انگیز نتیجہ سامنے آیا کہ مغرب کے حکمرانوں، پالیسی سازوں، دانشوروں اور میڈیا کی جانب سے عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اسلام کے خلاف زبردست پروپیگنڈے کے باوجود مغرب کی عورتوں میں اسلام کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلام ان کے حقوق کا، ان سے مرد بننے کا مطالبہ کیے بغیر، بہتر تحفظ کرتا، انہیں عزت و احترام عطا کرتا اور بحیثیت انسان انہیں مردوں کے مساوی مقام دیتا ہے۔ لہٰذا ہم اب اسلام میں عورتوں کے حقوق کے اہم انکات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

1- http://www.utexas.edu/utpress/books/vanwom.html

2- http://www.utexas.edu/utpress/books/vanwom.html

3- http://news.bbc.co.uk/2/hi/uk_news/england/3673730.stm

4- http://yvonneridley.org/2006/how-i-came-to-love-the-veil

5- http://www.dailymail.co.uk/femail/article1325231-/Why-I-love-Islam-Lauren-Booth-defiantly-explains-Muslim.html)

6- http://www.henrymakow.com/180902.html

7- http://www.henrymakow.com/180902.html

باب پنجم

تحریک نسواں اور اسلام

مغربی خواتین کے قبول اسلام کے اصل اسباب

حقوق نسواں کی مغربی تحریک کے مایوس کن نتائج

مغرب میں حقوق نسواں کی تحریک مردوں کے مساوی مقام اور حقوق کے لیے شروع ہوئی تھی لیکن حقوق کے نام پر عورت کو جو کچھ ملا ہے' پچھلے صفحات میں واقعاتی حقائق کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ اس کے نتیجے میں اس کی زندگی شدید مسائل اور مشکلات کا شکار ہوگئی ہے۔ گھر کا سکون اور تحفظ اس سے چھن گیا ہے۔ خاندان کے ادارے کی ٹوٹ پھوٹ نے اسے بالعموم مستقل رفیق حیات کی معیت سے محروم کردیا ہے۔ با قاعدہ شادیاں اول تو کم ہی ہوتی ہیں اور ہوں بھی تو عموماً ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ ورنہ اکثر صورتوں میں اب مرد اور عورت کی رفاقت محض وقتی لذت اندوزی اور عارضی وقت گزاری کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اگر اولاد ہوجائے تو وہ عموماً صرف عورت کی ذمہ داری قرار پاتی ہے۔ اس صورت حال نے اس کے نازک کاندھوں پر تن تنہا بچوں کی پرورش اور معاش کی جدوجہد کی دُہری ذمہ داری ڈال دی ہے۔ جبکہ ملازمت کی جگہوں پر بھی اسے اکثر ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا پیمانہ اس کی اہلیت، فراست، محنت، دیانت اور اچھے اخلاق و کردار سے زیادہ عملاً اس کی جسمانی کشش اور اس کا حسن ہوتا ہے اور یوں عملاً اس کی حیثیت مردوں کا دل بہلانے کے کھلونے کی سی ہوگئی ہے۔ عورتوں کے خلاف جنسی تشدد میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے اور صورت حال روز بروز زیادہ سنگین ہوتی جارہی ہے۔

تحریک حقوق نسواں کی بنیادی غلطی

عورت سے مرد بننے کا مطالبہ

مغرب میں حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کے یہ بھیانک نتائج ایک بنیادی غلطی کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مردوں کے مساوی حقوق کے لیے عورت کا مردوں جیسا ہی بننا بھی ضروری سمجھ لیا گیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں عورت کا مرد کے شانہ بشانہ ہونا ہی اس کی ترقی کا واحد طریقہ قرار پایا۔ اس رویے کے پیچھے لازمی طور پر یہ سوچ کارفرما تھی کہ مرد، عورت سے برتر ہے اور عورت اسی صورت میں مرد کے ہم رتبہ ہوسکتی ہے جب وہ، مردوں والے سارے کام کرنے لگے۔ حالانکہ مرد اور عورت کی فطری ساخت، ان کی نفسیات، جذباتی کیفیات اور مزاجوں کا فرق یہ ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ زندگی کے میدان میں ان کے دائرہ کار الگ الگ ہیں۔ گھر سے باہر کی جدوجہد بنیادی طور پر مرد کے ذمہ ہے جبکہ گھر کی مالکہ کی حیثیت سے اسے اپنے خاندان، اپنے شوہر اور بچوں کے لیے پیار محبت اور سکھ چین کا گہوارہ بنانا عورت کا کام ہے۔ اپنے اس کام کی وجہ سے عورت کو مرد سے کمتر سمجھنا ہرگز دانشمندی نہیں۔ جس طرح یہ بحث بے معنی ہے کہ ڈاکٹر برتر ہے یا انجینئر، کیونکہ دونوں کا کام اپنی اپنی جگہ یکساں طور پر اہم ہے، اسی طرح عورت اور مرد کے فطری دائرہ کار کے سبب عورت کو مرد سے کمتر سمجھنا بھی غلط ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ڈاکٹر کو حقوق اسی وقت ملیں گے جب وہ انجینئر والا کام کرکے دکھائے تو ایسے شخص کی دماغی صحت پر لازماً شبہ کیا جائے گا۔ تاہم مغرب کی عورت کو یہی سمجھایا گیا کہ تم چونکہ عورت ہونے کی وجہ سے مرد سے کمتر ہو اس لیے تمہیں مردوں جیسا بن کر دکھانا ہوگا۔ اور وہ بے چاری اس فریب میں پوری طرح گرفتار ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور معاش کی جدوجہد کی سہ طرفہ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے کچلی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جذباتی تسکین کے لیے اسے شوہر یا بوائے فرینڈ کی صورت میں مردوں سے مخصوص تعلقات کے تقاضے بھی نبھانا ہوتے ہیں۔ پچھلے صفحات میں ہم نے دیکھا کہ مغرب کی عورت اس صورت حال سے بری طرح تنگ آچکی

ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اسے مردوں کے مساوی حقوق اس کی نسائیت کو قائم رکھتے ہوئے ہی دیے جائیں اور ان کے لیے اس سے مرد جیسا بننے کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

بہتر متبادل کی تلاش۔ مغربی عورت کی ضرورت

ان حالات میں کسی ایسے متبادل نظام کی تلاش مغرب کی عورت کی ناگزیر ضرورت ہے جس میں اسے مردوں کے مساوی حقوق عورت رہتے ہوئے ہی مل سکیں۔ مغرب میں عورتوں کی اسلام سے بڑھتی ہوئی دلچسپی اور قبول اسلام کے حیرت انگیز رجحان کا درحقیقت یہی اصل سبب ہے۔ مسلمان ہونے والی مغربی خواتین کے بیانات سے واضح ہے کہ وہ مسلمانوں کے عملی رویوں کو پیش نظر رکھ کر نہیں بلکہ اسلام کو اس کے اوصاف کی بنیاد پر قبول کر رہی ہیں اور انہیں اس بات کا پورا شعور ہے کہ مسلمانوں کی اسلام سے دوری کے نتیجے میں مسلمان معاشروں میں عورت کے حقوق اور دوسرے حوالوں سے جو خامیاں نظر آتی ہیں، ان کا اسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔

مغربی عورت سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کا شکار

جہاں تک مغرب کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں عورت کے حقوق کے تمام تر پروپیگنڈے کے باوجود اس کی بے توقیری اور ناقدری کا معاملہ ہے تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام انتہائی خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت کو اس کے اصل دائرہ کار یعنی نئی نسل کی پرورش اور تربیت کے لیے فارغ رکھنے کے بجائے اپنے کارخانوں اور کارگاہوں کو سستی لیبر مہیا کرنے کے لیے چوکوں اور بازاروں میں لے آیا ہے۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی عمارت جس بنیاد پر اٹھائی گئی ہے، وہ حرص و ہوس، لالچ اور خود غرضی ہے۔ اس نظام میں کامیابی کا معیار اپنے منافع کو زیادہ سے زیادہ بڑھاتے چلے جانا ہے خواہ اس کے لیے انسانیت کے تقاضوں کو کتنا ہی پامال کرنا پڑے۔ اس نظام میں کسی اخلاقی قدر کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس نظام کے تحت مردوں کی جانب سے عورتوں کے ساتھ عزت و احترام پر مبنی اس اخلاقی برتاؤ کی

توقع ہی نہیں کی جاسکتی جس کا تجربہ برطانوی نومسلمہ ایوان رِڈلے نے افغانستان میں طالبان کی قید میں رہ کر کیا۔ مفاد پرستی اور خودغرضی پر استوار اس نظام میں عورت جس قسم کے استحصال سے دوچار ہے، وہ اس نظام کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔

بائبل میں عورت پیدائشی گناہ گار قرار دی گئی ہے

مغرب میں عورت کی بے توقیری کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کے برعکس بائبل میں عورت کو برائی کا محور اور اُس ''ازلی گناہ'' کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے جس کے نتیجے میں آدم وحوا کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا گیا۔ اس کے باوجود کہ بائبل اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں اور اس میں بے شمار تحریفات اور تبدیلیوں سے انکار محال ہے، یہی بائبل صدیوں سے اہل مغرب کے مذہبی عقائد کی بنیاد ہے۔ اس بائبل میں عورت کو جس طرح ازلی مجرم کی حیثیت دی گئی ہے، شجر ممنوعہ کا پھل چکھنے کی تفصیلات پر مبنی کتاب پیدائش کے تیسرے باب میں بیان کردہ کہانی اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اس داستان پر مشتمل بائبل کی کتاب پیدائش کے تیسرے باب کی پہلی آیت سے ۱۸ ویں آیت تک کا متن ملاحظہ فرمایئے:

''اور سانپ کل دشتی جانوروں میں سے جن کو خدا نے بنایا تھا، چالاک تھا۔ اس نے عورت سے کہا کہ کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے پھل تو ہم کھاتے ہیں، پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا، نہ چھونا ورنہ مرجاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے۔ بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے، تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوش نما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔''

''تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں۔ اور انہوں نے انجیر

کے پتوں کو سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں۔ اور انہوں نے خداوند کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغوں میں پھرتا تھا، سنی۔ اور آدم اور اس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپالیا۔ اس نے کہا کہ تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے، اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا کہ اس لیے کہ تو نے یہ کیا، تو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھہرا۔ تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹے گا۔ اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا۔"

"پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی، اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ اور آدم سے اس نے کہا کہ چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا، اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا۔ اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹ کٹارے اُگائے گی۔"

قرآن نے ازلی گناہ کے الزام سے عورت کو نجات دی

بائبل کی اس کہانی کے برعکس قرآن کا بیان یہ ہے کہ شجر ممنوعہ کے قریب نہ جانے کے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرانے کے لیے شیطان نے آدم وحوا دونوں کو بیک وقت بہکایا اور دونوں نے اس کی ترغیب سے متاثر ہو کر غلطی کا ارتکاب کیا، پھر دونوں نے اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی بلا تاخیر اللہ سے معافی مانگی اور اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ جبکہ انسان کو زمین پر بھیجے جانے کا

ارادہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر ظاہر کر دیا تھا، اس لیے انسان کو سزا کے طور پر دنیا میں بھیجے جانے کا تصور بھی قرآن کی رو سے بے بنیاد ہے۔ یہ تفصیلات قرآن میں کئی مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔

سورۂ بقرہ کی ۳۰ ویں آیت سے ۳۳ ویں آیت تک کا مضمون وضاحت کرتا ہے کہ انسان کو زمین پر بحیثیت خلیفہ بھیجنے ہی کے لیے تخلیق کیا گیا تھا اور یہ بات اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے وجود میں لائے جانے سے قبل ہی فرشتوں کو بتادی تھی۔ ان آیات میں انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

''پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ'' میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' انہوں نے عرض کیا کہ'' کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں کرے گا؟ اور آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔'' اللہ نے فرمایا'' میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔'' اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا'' اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔'' انہوں نے عرض کیا ''نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔'' پھر اللہ نے آدم سے کہا'' تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔'' جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتادیے، تو اللہ نے فرمایا:'' میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اسے بھی میں جانتا ہوں۔''

انسان زمین پر بطور مجرم نہیں بحیثیت خلیفۃ اللہ بھیجا گیا

قرآن کے اس بیان سے یہ حقیقت صاف عیاں ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنے خلیفہ کی

حیثیت سے زمین پر بھیجنے ہی کے لیے تخلیق کیا تھا، اس لیے انسان کا زمین پر بھیجا جانا بائبل کے بیان کے برعکس، نہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سزا کے طور پر تھا نہ حضرت حوا علیہا السلام کو اس طرح کسی گناہ کی سزا دی گئی تھی۔ انسان کے زمین پر بھیجے جانے سے پہلے جو واقعات پیش آئے، انہیں بھی قرآن میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے جس سے انسان کے زمین پر بھیجے جانے کا اصل پس منظر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۳۴ تا ۳۶ میں ان امور کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

''پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔ پھر ہم نے آدم سے کہا کہ ''تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ پیو، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ نافرمانوں میں شمار ہو گے۔'' آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔''

قرآن کی رُو سے آدم و حوا دونوں کی خطا معاف کر دی گئی

اس سے اگلی دو آیات میں بتایا گیا ہے کہ اس موقع پر آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جسے اللہ نے قبول فرما لیا کیونکہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ سورۂ اعراف میں بھی ان واقعات کا ذکر ہے اور وہاں یہ بات اور بھی صراحت سے بتائی گئی ہے کہ آدم و حوا دونوں شیطان کی ترغیب کا شکار ہوئے۔ پھر دونوں نے اللہ سے معافی مانگی اور دونوں کو معاف کر دیا گیا۔ سورۂ اعراف کی متعلقہ آیات (۲۰ تا ۲۳) کا ترجمہ یہ ہے:

''پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکایا تا کہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں، ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان دونوں سے کہا ''تمہارے رب نے جو تمہیں اس

درخت سے روکا ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمہیں ہیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔'' اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیرخواہ ہوں۔ اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخرکار جب انہوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔ تب ان کے رب نے انہیں پکارا: ''کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہ روکا تھا، اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟'' دونوں بول اٹھے: ''اے رب ہم نے اپنے اوپر بڑا ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا تو ہم یقیناً تباہ ہو جائیں گے۔''

عورت کی بے توقیری میں بائبل کے بیانات کا حصہ

قرآن کا یہ بیان حضرت حوا کو موجودہ بائبل کے اس الزام سے کلیتاً بری قرار دیتا ہے کہ انہوں نے حضرت آدم کو اللہ کے حکم کو نظر انداز کرنے پر آمادہ کیا جس کی پاداش میں انسان کو جنت سے نکال کر زمین پر پھینک دیا گیا، اور حضرت حوا کی اس خطا کی سزا قیامت تک دنیا میں آنے والی ہر عورت کو دردِ حمل اور شوہر کی محکومی کی شکل میں بھگتنا ہوگی۔ قرآن کے اس اعلان نے کہ غلطی کا ارتکاب آدم و حوا دونوں سے یکساں طور پر ہوا اور دونوں نے توبہ کرکے معافی پائی، اسلام میں عورت کے لیے عزت و احترام پر مبنی شاندار مقام کی راہ ہموار کی جبکہ بائبل کی تعلیمات کے سبب سیکولرازم کے تمام دعووں کے باوجود مغرب کے اذہان میں عورت کے بارے میں پیدائشی گناہگار ہونے کا تصور موجود چلا آرہا ہے۔ مغرب میں روشن خیالی کے تمام دعووں کے باوجود اگر آج بھی عورت کو وہ احترام حاصل نہیں جو اس کا اولین اور لازمی حق ہے تو اس میں عورت کے بارے میں بائبل کے ان تصورات کا بھی یقیناً حصہ ہے۔

اسلامی معاشرے میں عورت کا احترام۔ قرآنی تعلیمات کا نتیجہ

اس کے مقابلے میں مسلمان معاشروں میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جانے کے باوجود عورت

کو جو تقدس اور احترام حاصل ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن نے عورت کی پوزیشن صاف کی ہے، اس کے بارے میں پیدائشی گنہگار ہونے کے بے بنیاد تصور کی واضح طور پر تردید کی ہے اور بحیثیت انسان اسے مردوں کے مساوی حقوق عطا کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں اسلام قبول کرنے والی خواتین ببانگ دہل کہہ رہی ہیں کہ مغرب میں آج عورتیں جن حقوق کے لیے لڑ رہی ہیں یا پچھلے کچھ عشروں میں جو حقوق انہیں گھر کا سکون اور تحفظ قربان کر کے ملے ہیں، اسلام عورتوں کو وہ سارے حقوق تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہی، چادر اور چار دیواری کے تحفظ سے انہیں محروم کیے اور چوکوں اور بازاروں کی زینت بنائے بغیر ہی عطا کر چکا ہے۔ ایک ناواقف شخص کے لیے اس بات پر یقین کرنا بلاشبہ مشکل ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق ڈیڑھ ہزار سال پہلے دیے تھے، وہ دور حاضر کی ضروریات اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ یقیناً یہی تصور کرے گا کہ عورت کو جو حقوق ساتویں صدی عیسوی میں دیے گئے تھے وہ آج اکیسویں صدی میں لازماً ازکاررفتہ اور فرسودہ ہو چکے ہوں گے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے عطا کردہ یہ حقوق ہر دور کی طرح آج کے دور کے تقاضوں کی بھی پوری طرح تکمیل کرتے ہیں۔

عورتوں کے حقوق - بنیادی اپروچ

مولانا مودودی عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اسلام کے فکر و فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

عورت اور مرد میں حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے جو فرق ہے اس کو وہ بعینہٖ قبول کرتا ہے، جتنا فرق ہے اسے جوں کا توں برقرار رکھتا ہے اور جیسا فرق ہے اس کے لحاظ سے ان کے مراتب اور وظائف مقرر کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال عورت کے حقوق کا ہے۔ ان حقوق کی تعیین میں اسلام نے تین باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

- ایک یہ کہ مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیے گئے ہیں

ان سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے اور ایسا نہ ہو کہ تابع ومتبوع کا تعلق عموماً لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔

- دوسرے یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ نظامِ معاشرت کے حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے۔
- تیسرے یہ کہ عورت کے لیے ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو۔ مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے، نہ مردانہ زندگی کے لیے اس کو تیار کرنا اس کے لیے اور تمدن کے لیے مفید ہے اور نہ مردانہ زندگی میں وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔

مذکورہ بالا تینوں امور کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھ کر اسلام نے عورت کو جیسے وسیع تمدنی و معاشی حقوق دیے ہیں اور عزت وشرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں، اور ان حقوق و مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائیدار ضمانتیں مہیا کی ہیں، ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظامِ معاشرت میں نہیں ملتی۔[1]

اسلام میں عورتوں کے حقوق - جدید یا فرسودہ؟

اسلام میں عورت مرد کے مساوی کس طرح ہے، اسلام نے اسے کیا حقوق دیے اور کیا مرتبہ عطا کیا ہے، اور یہ سب کچھ دور حاضر کے تقاضوں سے کس طرح پوری مطابقت رکھتا ہے، آیئے اس موضوع پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔[2]

عورتوں کے حقوق کی جدید تعریف

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ’’عورتوں کے حقوق سے وہ حقوق مراد ہیں جو عورتوں کو سماجی اور قانونی لحاظ سے مردوں کے مساوی مقام تک پہنچاتے ہیں‘‘..... ’’عورتوں کے لیے مردوں کے برابر مانگے جانے والے ان حقوق میں ووٹ دینے کا حق، اور جائیداد کا حق وغیرہ شامل ہیں۔‘‘

عورتوں کے حقوق مغرب میں

اگر ہم اسلام میں عورتوں کے حقوق کے اس تصور سے اتفاق کریں جو مغرب میں پھیلایا گیا ہے تو یہ باور کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسلام میں عورتوں کے حقوق فرسودہ ہو چکے ہیں۔ جبکہ مغرب میں عورتوں کے حقوق کے نام پر جو کچھ انہیں دیا گیا ہے وہ فی الحقیقت حقوق کے نام پر ان کے جسم کے استحصال، ان کی عفت و عزت کا چھین لیا جانا اور ان کی روح کی تذلیل کے مترادف ہے۔

مغربی معاشرہ جو اسلام میں عورت کے مقام کو بلند کرنے کی ضرورت کا اظہار کرتا ہے، اس نے خود عملی طور پر عورت کے مقام کو طوائفوں، داشتاؤں اور معاشرے کی تتلیوں تک گرا دیا ہے اور اب وہ جنس فروشوں اور لذت اندوزی کے خواہش مندوں کے ہاتھوں میں کھلونوں کی حیثیت رکھتی ہے اور اس پر فن و ثقافت کا رنگین پردہ ڈال دیا گیا ہے۔

عورتوں کے حقوق اسلام میں

اسلام نے انتہائی انقلابی اقدامات کے ذریعے ڈیڑھ ہزار سال پہلے عورتوں کو ان کے واجب حقوق اور مقام دیا۔ عورتوں کی بہتری و ترقی اور آزادی کے لیے اپنی سوچ، اپنی معاشرت، اپنی دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے کی صلاحیتوں، اور کوششوں کو جدید بنانا اسلام کا مقصد پہلے بھی تھا اور کسی تعطل کے بغیر آج بھی ہے۔ موضوع پر مزید گفتگو سے پہلے میں آپ کی توجہ چند نکات کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا۔

چند اہم نکات

- دنیا کی آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ دنیا میں مختلف قسم کے مسلمان معاشرے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض اسلام سے قریب ہو سکتے ہیں اور بعض بہت دور۔
- اسلام میں عورتوں کے حقوق کو مستند ماخذوں پر جانچا پرکھا جانا چاہیے، نہ کہ اس پر کہ

عام مسلمان یا مسلمان معاشرے کیا کرتے ہیں۔

- اسلام کے مستند ماخذ اللہ کا کلام قرآن اور اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور احادیث ہیں۔
- قرآن کا کوئی حصہ اس کے کسی دوسرے حصے کی کبھی تردید نہیں کرتا، نہ مستند حدیث کی کوئی دوسری مستند حدیث تردید کرتی ہے، اور نہ یہ دونوں مستند ماخذ ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔
- بعض اوقات علماء میں اختلافات ہوتے ہیں اور اکثر یہ اختلافات کسی ایک مخصوص آیت کے بجائے قرآن کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں تجزیے سے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی کسی خاص آیت میں اگر کوئی ابہام ہے تو اس کی وضاحت اکثر قرآن میں کسی اور مقام پر موجود ہوتی ہے۔
- اللہ کی رضا کی جستجو، اس دنیا میں اس کے امین کی حیثیت سے کام کرنا، اور شہرت کے حصول کی کوشش یا اپنی انا کی تسکین کے لیے کام کرنے سے بچنا ہر مسلمان مرد اور عورت کی ذمہ داری ہے۔

اسلام کی رُو سے مرد وعورت مساوی ہیں، یکساں نہیں

اسلام مردوں اور عورتوں کی برابری پر یقین رکھتا ہے، برابری کا مطلب یکسانیت یعنی ایک جیسا ہونا نہیں ہے۔ اسلام میں مرد اور عورت کا کردار ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والا ہے، باہم متنازع اور متصادم نہیں۔ اس کی حیثیت ایک شراکت کی ہے جو ایک دوسرے کی مخالفت پر مبنی نہیں کہ دونوں جانب سے ایک دوسرے پر بالادستی کی کوشش کی جائے۔

جنت میں داخلے کا پیمانہ صنف نہیں

مغرب میں اسلام سے متعلق سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام میں جنت صرف

مردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ قرآن کی تصریحات کی روشنی میں یہ خیال مکمل طور پر بے بنیاد ٹھہرتا ہے۔ سورہ نساء کی آیت ۱۲۴ میں کہا گیا ہے ''اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔'' سورہ نحل کی آیت ۹۷ میں بھی یہی بات کہی گئی ہے ''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔'' ایسا اس لیے ہے کیونکہ اسلام میں صنف جنت میں داخلے کا معیار نہیں ہے۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق کی چھ قسمیں

اسلام عورتوں کو جو حقوق دیتا ہے ان کے یہ چھ گروپ بن سکتے ہیں: روحانی حقوق، معاشی حقوق، معاشرتی حقوق، تعلیمی حقوق، قانونی حقوق، سیاسی حقوق۔

اسلام میں عورتوں کے روحانی حقوق

مغربی دنیا میں ایک اور غلط فہمی یہ موجود رہی ہے کہ ''عورت روح نہیں رکھتی''۔ درحقیقت یہ سترھویں صدی کی بات ہے جب روم میں دانش مند مردوں کی کونسل (Council of wise men) کا اجلاس ہوا، اور انہوں نے اس پر مکمل اتفاق کیا کہ عورت روح نہیں رکھتی۔ لیکن اسلام میں مرد اور عورت دونوں یکساں روحانی فطرت کے حامل ہیں۔ یہ بات قرآن میں کہی گئی ہے۔ سورۂ نساء کی پہلی آیت کے الفاظ ہیں ''اے انسانو، اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔'' اسی نوعیت کی بات سورہ نحل آیت ۷۲ میں کہی گئی ہے: اور وہ اللہ ہی جس نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں۔'' سورۂ شوریٰ کی گیارھویں آیت میں کہا گیا ہے: ''وہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے اور اسی نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے ہیں۔''

قرآن میں صاف طور پر یہ ذکر موجود ہے کہ خدا نے انسان کے اندر اپنی روح میں سے کچھ پھونکا، سورہ الحجر آیت ۲۹ میں کہا گیا ہے: ''اور جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔'' یہی بات سورۂ سجدہ کی نویں آیت میں بھی کہی گئی ہے کہ: ''پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا۔'' اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ انسان میں حلول کر گیا بلکہ یہ ہے کہ خدائے قادر مطلق نے ہر انسان کو اپنی روحانیت اور علم میں سے کچھ عطا کیا ہے اور ہر انسان اس سے قریب تر ہے۔

واضح رہے کہ یہ بات آدم اور حوا علیہا السلام، دونوں کے لیے ہے کیونکہ مرد یا عورت کے بجائے انسان اور بشر کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لیے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کے بیان کے مطابق دونوں میں خدا کی روح میں سے کچھ پھونکا گیا۔ اسی طرح ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا نائب، امین یا خلیفہ بنایا ہے۔ جیسے کہ سورہ بنی اسرائیل کی ۷۰ ویں آیت میں کہا گیا ہے ''ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی ... اور اپنی بہت سے مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔'' یہاں بنی آدم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس کا مطلب آدم کی تمام اولاد ہے جس میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ تاہم بعض مذہبی کتابوں مثلاً بائبل میں انسان کے زمین پر بھیجے جانے کا سبب بننے کا الزام حضرت حوا پر عائد کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کی سورۂ اعراف کی ۱۹ویں سے ۲۷ویں آیت تک کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں حضرت آدم اور حضرت حوا علیہا السلام بیک وقت دونوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ ان آیات میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ کی حکم عدولی کے مرتکب ہوئے، دونوں نے معافی مانگی، دونوں نے توبہ کی اور دونوں کو معاف کر دیا گیا۔ جبکہ بائبل کی کتاب پیدائش کے تیسرے باب میں صرف حضرت حوا کو انسان کے جنت سے نکالے جانے اور زمین پر بھیجے جانے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اور اصل گناہ کے عقیدے کی رو سے حوا علیہا السلام کی وجہ سے سارے انسان پیدائشی گناہ گار ٹھہرے ہیں۔

عمل تولید عورت کے لیے باعث عزت یا باعث ذلت؟

بائبل کی کتاب ''پیدائش'' کے تیسرے باب کی سولہویں آیت میں کہا گیا ہے: پھر اس نے عورت سے کہا: میں تیرے درد حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی پھر بھی تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔'' اس کا مطلب ہے کہ حمل اور بچے کی پیدائش بائبل کی رو سے عورت کو بے توقیر کرنے کے لیے ہیں اور درد حمل اس کے لیے سزا کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ قرآن حمل اور بچے کی پیدائش کو عورت کے لیے باعث اعزاز وتکریم قرار دیتا ہے۔ سورہ نساء کی پہلی آیت میں کہا گیا ہے ''رحمی رشتوں کا احترام کرو۔'' سورۂ لقمان کی آیت نمبر 14 میں ہے ''اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا''۔ ایسی ہی ایک ہدایت سورۂ احقاف کی آیت نمبر 15 میں ہے '' ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت جھیل کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔'' قرآن کی ان ہدایات سے واضح ہے کہ اسلام میں حمل اور بچے کی پیدائش سے عورت کے مقام و مرتبے، اور عزت و احترام میں کمی نہیں، اضافہ ہوتا ہے۔

اللہ کی نگاہ میں مرد اور عورت کی فضیلت کا یکساں معیار

فضیلت کا واحد پیمانہ اللہ کے نزدیک تقویٰ یعنی خدا ترسی و پاکبازی ہے۔ سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ میں کہا گیا ہے: ''اے انسانو، ہم نے تمہیں مرد و عورت کے واحد جوڑے سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ راست باز ہے۔''

جنس، رنگ، ذات، دولت، اسلام میں انسانی فضیلت کا معیار نہیں ہیں۔ اللہ کی نگاہ میں

اس کا واحد پیمانہ پاکیزگی، راست بازی اور صالحیت ہے۔انسان مرد ہو یا عورت، اس کی جنس اللہ کے انعام کا پیمانہ ہے نہ سزا کا۔ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 195 میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا۔خواہ وہ مرد ہو یا عورت،تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔''

مردوں اور عورتوں کے لیے مساوی اخلاقی ذمہ داریاں

سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ کے معنی ہیں:'' مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں،اور مومن مرد اور مومن عورتیں، اورراست باز مرد اور راست باز عورتیں، اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں،اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں،اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، کچھ شک نہیں کہ اللہ نے ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں مردوں اور عورتوں کی روحانی اور اخلاقی ذمہ داریاں یکساں ہیں۔دونوں کے لیے ایمان لانا ضروری ہے، دونوں کو نماز پڑھنی ہے، دونوں کو روزہ رکھنا ہے، دونوں کو خیرات کرنا ہے،وغیرہ وغیرہ۔لیکن اسلام میں عورتوں کو کئی معاملات میں چھوٹ دی گئی ہے۔ماہانہ ایام اور وضع حمل کے بعد ناپاکی کی حالت کے عرصہ میں عورت کے لیے نمازیں مکمل طور پر معاف ہیں جبکہ ان دنوں میں اسے روزے بھی نہیں رکھنے۔ان روزوں کی قضا اسے بعد میں کرنی ہے جب اس کی صحت اس کی اجازت دے۔

اسلام میں عورتوں کے معاشی حقوق

اسلام نے عورتوں کو مغرب کے مقابلے میں چودہ سو سال پہلے معاشی حقوق عطا فرمائے۔ ایک بالغ مسلمان عورت چاہے شادی شدہ ہو یا تنہا ہو، جائیداد کی مالک بن سکتی ہے، وہ کسی سے

مشورہ کیے بغیر اپنی کسی بھی جائیداد کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرسکتی، اسے فروخت کرسکتی یا اس سے دستبردار ہوسکتی ہے۔ جبکہ مغرب نے ۱۸۷۰ء میں پہلی بار انگلستان میں شادی شدہ عورت کے حقوق تسلیم کرتے ہوئے اسے کسی سے مشورہ کیے بغیر اپنی کسی جائیداد کو رکھنے یا اس سے دستبردار ہونے کی اجازت دی۔

عورتوں کے لیے کام کرنے کا حق

عورت کو اسلام نے یہ حق دیا ہے کہ اگر وہ کام کرنا چاہے تو کرسکتی ہے۔ قرآن کی کسی آیت یا کسی مستند حدیث میں عورتوں کو کام کرنے سے روکا نہیں گیا ہے جب تک کہ وہ غیر قانونی اور ناجائز نہ ہو، اسلامی شریعت کے دائرے میں ہو، اور وہ اس کام کے دوران اسلامی لباس و آداب کا اہتمام ملحوظ رکھے۔ لیکن فطری طور پر وہ ایسے کام نہیں کرسکتی جس میں اس کے حسن اور جسم کی نمائش ہوتی ہو، مثلاً ماڈلنگ اور فلمی اداکاری وغیرہ۔

بہت سے پیشے اور کام جو عورتوں کے لیے ممنوع ہیں، مردوں کو بھی ان کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر شراب فروشی، جوا خانوں میں کام، کوئی بھی غیر اخلاقی اور بددیانتی پر مبنی کام۔ ایسے تمام کام مرد و عورت دونوں کے لیے ممنوع ہیں۔ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ عورتوں سے ڈاکٹری جیسے پیشے اختیار کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ ہمیں خاتون گائنا کالوجسٹ کی ضرورت ہے۔ ہمیں خاتون نرسیں درکار ہیں۔ ہمیں خواتین اساتذہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اسلام عورت پر مالی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ خاندان کے اندر مالی ذمہ داریوں کا بوجھ مرد کے کاندھوں پر ڈالا گیا ہے۔ اس لیے عورت کو اپنی گزر بسر کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب حقیقتاً حالات کا تقاضا ہو اور مالی بحران کی وجہ سے ضروریات کی تکمیل محال ہوگئی ہو، تو عورت کام کرنے کا راستہ اختیار کرسکتی ہے۔ تاہم ان حالات میں بھی کوئی اسے کام کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ وہ اس سلسلے میں اپنی آزاد مرضی سے جو فیصلہ چاہے کرسکتی ہے۔

عورتوں کے لیے مالی تحفظ

عورت کو اسلام میں مرد کے مقابلے میں زیادہ مالی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔جیسا کہ پہلے بتایا گیا مالی ذمہ داری کا بوجھ عورت پر نہیں ڈالا گیا ہے، بلکہ خاندان کے اندر یہ ذمہ داری مرد کو دی گئی ہے۔عورت کی شادی سے پہلے اس کی مالی ضروریات کی تکمیل باپ یا بھائی کے ذمہ ہے، اور شادی کے بعد یہ ذمہ داری شوہر یا بیٹے پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کے کھانے پینے، لباس، رہائش اور مالی ضروریات پوری کریں۔

عورت کے لیے شادی کا لازمی تحفہ

شادی ہوتی ہے تو عورت فوائد حاصل کرنے والی ہوتی ہے۔شادی کا تحفہ جو مہر کہلاتا ہے، اس کا لازمی حق ہے جسے ادا کرنے کا شوہر پابند ہوتا ہے۔یہ ہدایت قرآن میں دی گئی ہے، سورۂ نساء کی چوتھی آیت میں کہا گیا ہے ''اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔'' اسلام میں شادی کے انعقاد کے لیے مہر لازمی ہے۔لیکن بدقسمتی سے یہاں بہت سے مسلمان معاشروں میں قرآن کی شرط برائے نام مہر رکھ کر پوری کردی جاتی ہے جیسے برصغیر میں ۱۵۱ روپے یا ۷۸۶ روپے، جبکہ شادی کی تقریبات، ضیافتوں اور آرائش وغیرہ پر لاکھوں روپے خرچ کردیے جاتے ہیں۔اسلام میں مہر کے لیے کوئی کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ حد مقرر نہیں کی گئی ہے مگر جب ایک شخص شادی کی استقبالیہ ضیافت پر لاکھوں روپے خرچ کرسکتا ہے تو یقینی طور پر مہر بھی بہت زیادہ ہونا چاہیے۔

بیوی سے جہیز کا مطالبہ اسلام میں ممنوع ہے

مسلم معاشروں میں مختلف ثقافتوں کے طور طریقے شامل ہوگئے ہیں خصوصاً ہندو پاک کے علاقے میں۔وہ مہر میں ایک چھوٹی سی رقم دے کر امید رکھتے ہیں کہ بیوی جہیز میں فریج، ٹی وی سیٹ، حتیٰ کہ ایک اپارٹمنٹ، کار، قیمتی زیورات اور بھاری رقم سب کچھ لے کر آئے۔ان توقعات اور مطالبات کا انحصار شوہر کی حیثیت پر ہوتا ہے۔مثلاً اگر وہ گریجویٹ ہے تو ایک لاکھ کی توقع رکھی

جاسکتی ہے، اگر انجینئر ہے تو تین لاکھ اور ڈاکٹر ہے تو پانچ لاکھ کا مطالبہ ہوسکتا ہے۔ یہ طرز عمل اسلام کے منشاء اور تعلیمات کے بالکل منافی ہے۔ اگر لڑکی کے سرپرست اپنی آزاد مرضی سے لڑکی کو کچھ دیں تو یہ قابل قبول ہے لیکن ان سے کسی بھی چیز کا براہ راست یا بالواسطہ مطالبہ اسلام میں قطعی ممنوع ہے۔

عورت کی کوئی مالی ذمہ داری نہیں

اگر کوئی عورت کام کرے، جو اس کے لیے لازم نہیں، تو وہ جو کچھ اور جتنا بھی کمائے، اس کی ساری آمدنی خالصتاً اسی کی ملکیت ہوگی۔ اسے گھریلو مصارف میں خرچ کرنا یا نہ کرنا اس کے اپنے فیصلے پر منحصر ہے۔ وہ اپنی آزاد مرضی اور خوشی سے ایسا کرے تو اور بات ہے۔ شوہر کتنا غریب یا کتنا امیر ہے، اس سے قطع نظر، بیوی کی خوراک، لباس، رہائش، علاج معالجہ اور اس کی تمام ضروریات کی تکمیل بہرصورت شوہر کی ذمہ داری ہے۔ طلاق کی صورت میں، اسے عدت کی میعاد کے دوران مالی مدد فراہم کرنا بھی مرد کے ذمہ ہے۔ اور اگر وہ عورت بچوں والی ہو تو بچوں کی ضروریات کے لیے رقم مہیا کرنا بھی مرد پر لازم ہے۔

وراثت میں حصہ۔ عورت کا حق

اسلام نے عورت کو وراثت کا حق مغرب سے صدیوں سے پہلے عطا کیا۔ قرآن کی سورۂ نساء، سورۂ بقرہ، اور سورۂ مائدہ کی متعدد آیتوں میں کہا گیا ہے کہ عورت بلا لحاظ اس کے کہ وہ بیوی ہے، یا ماں، بہن یا بیٹی، وراثت کا حق رکھتی ہے۔ اور یہ خدائے قادر مطلق کی طرف سے قرآن میں متعین کر دیا گیا ہے۔

اسلام میں عورت کے معاشرتی حقوق

ان حقوق کی درجہ بندی چار ذیلی سرخیوں کے تحت کی جاسکتی ہے۔ بیٹی کو دیے گئے سماجی حقوق، بیوی کو دیے گئے سماجی حقوق، ماں کو دیے گئے سماجی حقوق، بہن کو دیے گئے سماجی حقوق۔

بیٹی کے معاشرتی حقوق

اسلام نے عربوں میں جاری نوزائیدہ بچیوں کے قتل کے رواج کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ سورۂ تکویر کی آیت نمبر ۸ اور ۹ میں کہا گیا ہے ''اور جب زندہ دفن کر دی جانے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی؟''۔ صرف نومولود لڑکیوں ہی کا قتل نہیں اسلام میں ہر قسم کی طفل کشی قطعی ممنوع قرار دی گئی ہے خواہ اس کی جنس کچھ بھی ہو۔ یہ بات سورۂ اَنعام کی آیت نمبر ۱۵۱ میں یوں کہی گئی ہے ''اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔'' ایسی ہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں بھی کہی گئی ہے: ''اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل بڑا گناہ ہے''۔

اسلام سے پہلے عرب میں کسی کے گھر لڑکی پیدا ہوتی تو اکثر اسے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ الحمدللہ اسلام کے پھیلنے کے بعد یہ طریقہ ختم ہوگیا۔ مگر بدقسمتی سے ہندوستان میں یہ اب تک جاری ہے۔ بی بی سی کے ایک پروگرام میں جسے "Let Her Die" (اِس لڑکی کو مرنے دو) کا نام دیا گیا تھا، Emily Beckenen نامی برطانوی رپورٹر نے بھارت میں بیٹیوں کے قتل پر ایک تحقیقی رپورٹ میں انکشاف کیا تھا کہ بھارت میں ہر روز تین ہزار سے زیادہ حمل جنین کے مؤنث ہونے کا پتہ چل جانے کی وجہ سے ضائع کرائے جاتے ہیں۔ اس حساب سے سال بھر میں دس لاکھ سے زیادہ جنین اس ملک میں بیٹی سے بچنے کے لیے ضائع کرادیے جاتے ہیں۔ اور تامل ناڈو جیسے صوبوں میں بڑے بڑے اشتہاری بورڈ اور پوسٹر نظر آتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے کہ پانچ سو روپے خرچ کریں اور پانچ لاکھ روپے بچالیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ آپ الٹرا سونوگرافی یا امینوسین ٹنٹس جیسے میڈیکل ٹسٹ کرا کے ہونے والے بچے کی جنس کا پتہ چلالیں۔ اور اگر یہ لڑکی ہو تو آپ حمل ضائع کرا کے پانچ لاکھ روپے بچا سکتے ہیں۔ کیسے؟ بیٹی کی پرورش پر آپ جو رقم خرچ کریں گے اور پھر شادی کے موقع پر ہندوستان کے رواج کے مطابق لاکھوں کا جو جہیز اس کی سسرال بھیجیں گے، حمل ختم کرا کے یہ ساری رقم بچائی جاسکتی ہے۔ تامل ناڈو کے سرکاری اسپتال کی

رپورٹ کے مطابق اس طرح دس لڑکیوں میں سے چار کو مار دیا جاتا ہے۔اس لیے ہندوستان میں عورتوں کی آبادی کا مردوں سے کم ہونا باعث حیرت نہیں ہے۔دختر کشی کا طریقہ ہندوستان میں صدیوں سے جاری ہے۔

قرآن بیٹیوں کے قتل ہی کو ممنوع قرار نہیں دیتا، بلکہ بیٹے کی ولادت پر خوشی کے مقابلے میں بیٹی کی پیدائش پر رنج و ملال پر بھی گرفت کرتا اور اس روش کی مذمت کرتا ہے۔اسلام میں بیٹی کی اچھی پرورش اور تعلیم و تربیت کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ بیٹی اور بیٹے کی پرورش میں جانبداری اور امتیازی سلوک کی قطعی ممانعت ہے۔ایک حدیث کے مطابق ، نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص نے اپنے بیٹے کو پیار کیا اور اپنی گود میں بٹھایا لیکن اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس رویے پر گرفت کی اور اس شخص سے کہا کہ تم بے انصافی کے مرتکب ہوئے ہو، تمہیں اپنی بیٹی کو بھی پیار کرنا اور اپنی گود میں دوسری طرف بٹھانا چاہیے۔

بیوی کے معاشرتی حقوق

تمام سابقہ تہذیبوں میں عورت کو شیطان کا آلہ کار سمجھا جاتا تھا۔لیکن قرآن نے عورت کو ''محصنہ'' کا نام دیا ہے جس کے معنی ہیں: شیطان سے بچانے والا قلعہ۔یعنی ایک نیک بیوی اپنے شوہر کو غلط راستے پر جانے سے بچاتی ہے۔ رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں۔'' اور صحیح بخاری جلد سات باب تین کی حدیث نمبر تین کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو ہدایت کی کہ ان میں سے جن کے پاس شادی کے لیے وسائل ہیں انہیں شادی کر لینی چاہیے کیونکہ یہ ان کی نظر اور عفت و حیا کی حفاظت کرے گی۔قرآن کے مطابق اللہ نے شوہر اور بیوی کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت رکھ دی ہے۔ سورہ روم کی آیت نمبر ۲۱ میں کہا گیا ہے'' اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے دلوں میں محبت اور رحمت رکھ دی۔''سورہ نساء کی آیت نمبر ۲۱ میں شادی کو ایک مضبوط معاہدہ قرار دیا

گیا ہے۔ اسی سورت کی آیت نمبر ۱۹ میں کہا گیا ہے کہ ''تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔'' مطلب یہ کہ شادی کے لیے دونوں فریقوں کی رضا مندی درکار ہے۔ مرد اور عورت دونوں کا شادی کے لیے راضی ہونا لازمی ہے۔ لڑکی کے باپ سمیت کوئی بھی اس کی مرضی کے خلاف اسے شادی پر مجبور نہیں کرسکتا۔ صحیح بخاری جلد سات کتاب ۶۲ حدیث نمبر ۶۹ کے مطابق ''ایک لڑکی کے باپ نے اسے اس کی مرضی کے خلاف شادی پر مجبور کیا، وہ لڑکی شکایت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شادی کو روک دیا۔ مسند احمد بن حنبل کی حدیث نمبر ۲۴۶۹ میں کہا گیا ہے کہ ''ایک لڑکی کے باپ نے اسے اس کی مرضی کے خلاف شادی پر مجبور کیا اور وہ شکایت لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم چاہو تو اس بات کو آگے بڑھنے دو اور چاہو تو انکار کردو۔'' اس سے واضح ہے کہ شادی کے لیے مرد اور عورت دونوں کی رضا مندی ضروری ہے۔

اسلام میں بیوی خانہ دار یا گھر والی یعنی گھر کی مالکہ سمجھی جاتی ہے، ہاؤس وائف نہیں کیونکہ اس کی شادی گھر کے ساتھ نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ ہاؤس وائف کی اصطلاح اس کا مطلب جانے بغیر استعمال کرتے ہیں، جبکہ اس کے معنی ہیں کہ آپ گھر کی بیوی ہیں۔ اگر خواتین اس کا صحیح مفہوم جان لیں تو وہ ہاؤس وائف کے بجائے ہوم میکر کہلانا پسند کریں گی۔

اسلام میں عورت کی شادی کسی آقا یا مالک سے نہیں ہوتی کہ اس کے ساتھ غلاموں والا برتاؤ کیا جائے۔ یہ رشتہ برابری کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مسند احمد بن حنبل کی حدیث نمبر ۷۳۶، ۷۳۹۶ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اہل ایمان میں سب سے بہتر وہ ہیں جن کا اخلاق اور برتاؤ سب سے اچھا ہے، اور جو اپنے گھر والوں اور اپنی بیویوں کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کرتے ہیں۔''

اسلام مرد اور عورت، دونوں کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بالکل واضح طور پر کہی گئی ہے کہ مرد اور عورت، شوہر اور بیوی تمام معاملات میں برابر کے حقوق رکھتے ہیں سوائے

خاندان کی سربراہی کے۔ یہ بات سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۸ میں یوں کہی گئی ہے:

''عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں، البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے۔''

بیشتر لوگ اس بات کا درست مفہوم سمجھنے میں، کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے، غلطی کر جاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں قرآن کا منشاء سمجھنے کے لیے پورے قرآن کو پیش نظر رکھنا چاہیے کیونکہ ایک بات کی تشریح اور وضاحت دوسری جگہ مل جاتی ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت کے ان الفاظ کا مطلب سورۂ نسا کی ۳۴ ویں آیت کی روشنی میں صاف ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے ''مرد عورتوں پر قوّام (یعنی ان کے محافظ و منتظم) ہیں کیونکہ خدا نے ان میں سے ایک کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ فضیلت (یعنی طاقت و توانائی) دی ہے اور وہ ان پر اپنے وسائل بھی خرچ کرتے ہیں۔''

لوگ سمجھتے ہیں کہ قوام کا مطلب حاکم ہونا ہے اور مرد اپنی حاکمیت کی وجہ سے عورت پر ایک درجہ برتری رکھتا ہے۔ لیکن دراصل قوام کا لفظ اِقامت سے نکلا ہے، اقامہ کا مطلب سمجھنے کے لیے نماز شروع ہونے سے پہلے کی اقامت کی مثال سامنے رکھیے۔ نماز سے پہلے اقامت کہی جاتی ہے تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اقامہ کا مطلب ہوا کھڑا ہونا۔ اس لیے قوام کا مفہوم ذمہ داری میں ایک درجہ زیادہ ہونا ہے۔ اور اس ذمہ داری کو شوہر اور بیوی کے باہمی مشورے سے ادا کیا جانا چاہیے۔

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۷ میں کہا گیا ہے ''تمہاری بیویاں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔'' لباس کا مقصد کیا ہے، یہ پوشش اور زینت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کی خامیوں کو چھپانا چاہیے اور ایک دوسرے کو خوش نما بنانا چاہیے۔

قرآن کہتا ہے کہ اگر تم اپنی بیوی کو پسند نہ بھی کرتے ہو تب بھی اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ۔ یہ بات سورۂ نساء کی ۱۹ ویں آیت میں اس طرح کہی گئی ہے ''ان کے ساتھ بھلے طریقے

سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز جو تمہیں پسند نہیں، اسی میں اللہ نے بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔'' اس سے واضح ہے کہ اگر آپ اپنی بیوی کو ناپسند کرتے ہوں تب بھی آپ کو اس کے ساتھ اچھا اور برابری کا سلوک کرنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں بیوی اور شوہر کے حقوق برابر ہیں۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں شوہر کو طلاق کا حق دیا گیا ہے وہاں بیوی کو بھی خلع کا حق دیا گیا ہے۔

ماں کے معاشرتی حقوق

ماں کے احترام سے صرف اللہ کی بندگی ہی بالاتر ہے۔ یہ بات سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ اور ۲۴ میں کہی گئی ہے۔'' اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں، تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت اور شفقت کے ساتھ بچپن میں مجھے پالا تھا۔'' اسی طرح سورۂ نساء کی پہلی آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ'' رحمی رشتوں کا احترام کرو''۔ سورۂ انعام کی آیت نمبر ۱۵۱ میں حکم دیا گیا'' والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔'' سورۂ لقمان آیت نمبر ۱۴ میں کہا گیا'' ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ مہربانی کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔'' سورۂ احقاف کی پندرھویں آیت میں بھی اسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث کے مطابق جو صحیح مسلم میں بھی ہے، ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس دنیا میں میری محبت، احترام اور حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ اللہ کے نبیؐ نے فرمایا: تمہاری ماں، انہوں نے کہا یا رسول اللہ، ان کے بعد؟ آپؐ نے پھر ارشاد فرمایا: تمہاری ماں، صحابیؓ نے تیسری بار پوچھا، اے اللہ کے نبیؐ، ان کے بعد

کون؟ اس بار بھی نبی کریمؐ نے جواب دیا: تمہاری ماں۔ صحابیؓ نے چوتھی بار یہی سوال دہرایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: تمہارا باپ۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی محبت اور احترام کا ۷۵ فی صد حق اس کی ماں کو پہنچتا ہے اور باقی ۲۵ فی صد کا مستحق باپ کو قرار دیا گیا ہے۔

بہن کے معاشرتی حقوق

اسلامی معاشرے میں بہن کی عزت و احترام مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ بہن کے حقوق کے ضمن میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ اسلامی اصولوں کی رو سے باپ کی عدم موجودگی یا اس کے اس لائق نہ ہونے کی صورت میں غیر شادی شدہ بہن کی کفالت مکمل طور پر بھائیوں کی ذمہ داری ہے۔

اسلام میں عورت کے تعلیمی حقوق

قرآن کی پہلی پانچ آیات جو نازل ہوئیں، سورۂ علق یا سورۂ اقراء میں شامل ہیں۔ ان پانچ آیات میں کہا گیا ہے'' اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے تخلیق کیا۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

قرآن میں انسان کو دی گئی پہلی ہدایت یہ نہیں تھی کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، خیرات کرو۔ اس کے بجائے اسے پڑھنے کی ہدایت کی گئی۔ اس سے واضح ہے کہ اسلام تعلیم کو انتہائی اہمیت دیتا ہے۔

اسلام میں تعلیم لازمی ہے

قرآن کہتا ہے'' تم میں سے جو لوگ ایمان والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا۔'' (۵۸:۱۱) اور قرآن ہمیں یہ دعا سکھاتا ہے کہ'' اے میرے رب، میرے علم میں اضافہ فرما'' (۲۰:۱۱۴)۔ قرآن کہتا ہے'' جسے حکمت ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت عطا کی گئی۔'' (۲:۲۶۹)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔''

(بیہقی) تصور کیجیے کہ چودہ سو سال پہلے جب عورتوں سے انتہائی برا سلوک کیا جاتا اور انہیں جائیداد کی طرح استعمال کیا جاتا تھا، اس وقت اسلام نے عورتوں کو علم حاصل کرنے کی تاکید کی۔ اسلام میں عورتوں کے ان حقوق کو فرسودہ کہا جائے گا یا جدید؟

اسلام میں عورت کے قانونی حقوق

اسلامی قانون کی رُو سے مرد اور عورت برابر ہیں۔ اسلامی قانون مرد اور عورت دونوں کے جان و مال اور جائیداد کا تحفظ کرتا ہے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کرے تو قاتل مرد کو قصاص کے تحت موت کی سزا دی جائے گی۔ قصاص کے اسلامی قانون کے مطابق، بلالحاظ اس کے کہ زخم آنکھ کا ہے، ناک کا ہے، کان کا ہے یا جسم کا، مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں سزا ہے۔ اور اگر مقتول کا سرپرست، خواہ وہ کوئی عورت ہو، کہے کہ قاتل کو معاف کر دیا جائے اور اس کے بدلے وہ دیت یعنی زرتلافی یا معاوضہ قبول کرنے کو تیار ہے، تو اس کی رائے مسترد نہیں کی جاسکتی۔ انہیں اسے ماننا ہوگا۔ اور اگر مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان اختلاف رائے ہو اور کچھ کا کہنا ہو کہ قاتل کو موت کی سزا ملنی چاہیے اور کچھ اسے معاف کر کے دیت قبول کر لینے کے حق میں ہوں، تو لوگوں کو مقتول عزیزوں کو قاتل کو قتل کرنے سے باز رکھنا چاہیے۔

سورۂ مائدہ کی ۳۸ ویں آیت کے مطابق ''چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے، اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔'' مطلب یہ کہ اگر ایک شخص چوری کرے تو قطع نظر اس کے کہ وہ مرد ہے یا عورت، اس کا ہاتھ کاٹ دیا جانا چاہیے۔ یعنی سزا مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی ہے۔ سورہ نور کی دوسری آیت ملاحظہ کیجیے۔ اس میں کہا گیا ہے ''زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد، دونوں کو ۱۰۰ کوڑے مارو۔'' اسلام میں زنا کی سزا یکساں ہے خواہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والا مرد ہو یا عورت۔ دونوں کے لیے سو کوڑے مارے جانے کی سزا ہے۔

اسلام میں عورت کو گواہ بننے کی اجازت ہے۔ تصور کیجیے اسلام عورت کو یہ حق ۱۴ صدی پہلے

دے چکا ہے جبکہ ابھی ۱۹۸۰ء تک یہودی ربی اس بات پر غور کررہے تھے کہ عورت کو گواہ بننے کی اجازت دی جائے یا نہیں۔ لیکن اسلام اسے یہ حق ۱۴۰۰ سال پہلے عطا کر چکا ہے۔

اسلام میں عورت کی عزت و عصمت کی حفاظت کو بہت اہم درجہ دیا گیا ہے۔ سورہ نور کی چوتھی آیت میں کہا گیا ہے ''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، اور پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو ۸۰ کوڑے مارو۔'' اسلام میں چھوٹے جرائم کے لیے دو گواہ درکار ہوتے ہیں اور بڑے جرم کے لیے آپ کو چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی عورت پر جھوٹا الزام لگانا اسلام میں ایک بڑا جرم ہے، لہٰذا آپ کو چار گواہوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ آج کے دور میں آپ ماڈرن سوسائٹی میں دیکھتے ہیں کہ مرد عورتوں پر الزام تراشی کرتے اور انہیں طرح طرح کے نام دیتے ہیں۔ وہ انہیں طوائف تک کہہ جاتے ہیں اور ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ اسلامی ریاست میں اگر کوئی مرد کسی عورت کو طوائف کا نام دے اور وہ عورت عدالت میں شکایت کر دے، اور الزام لگانے والا مرد عورت کے خلاف چار گواہ پیش نہ کر سکے، حتیٰ کہ اگر وہ چار گواہ پیش بھی کر دے اور ان میں سے ایک بھی جھوٹا ثابت ہو جائے تو ان سب کو اَسّی اَسّی کوڑے مارے جائیں گے اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عورت کی عفت و عصمت کو انتہائی اہمیت دیتا ہے۔

شادی کے بعد عورت اپنے نام کے ساتھ بالعموم اپنے شوہر کا نام لگاتی ہے۔ اسلام میں اسے اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو شوہر کا نام اپنے نام میں شامل کرے اور چاہے تو اپنا اصل نام برقرار رکھے۔ بلکہ اسلام میں اصل نام برقرار رکھنے کی سفارش کی گئی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے مسلمان معاشروں میں عورتیں شادی کے بعد اپنے شوہروں کے نام کو اپنے نام کا حصہ نہیں بناتیں بلکہ اپنا اصل نام برقرار رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کی رُو سے مرد اور عورت برابر ہیں۔

اسلام میں عورت کے سیاسی حقوق

سورۂ توبہ کی ۷۱ویں آیت میں کہا گیا ہے ''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور معاون ہیں۔'' اسلامی معاشرے میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے صرف سماجی معاملات میں نہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی معاون ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ عورتیں قانون سازی میں بھی حصہ لے سکتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک مشہور حدیث کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے ساتھ عورتوں کے مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنے کے بارے میں گفتگو اور مشاورت کر رہے تھے، کیونکہ زیادہ مہر کی وجہ سے مسلمان نوجوانوں کو شادی کرنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس اجتماع میں شامل ایک خاتون نے جو پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں، اس موقع پر کھڑے ہو کر اس خیال پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ جب سورۂ نساء کی ۲۰ویں آیت میں قرآن کہتا ہے کہ ''اگر تم انہیں ڈھیروں مال بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ واپس مت لینا۔'' تو عمر کو مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنے کا اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس پر حضرت عمرؓ نے فوراً کہا ''عمر غلط ہے اور یہ عورت صحیح ہے۔''

تصور کیجیے، وہ ایک عام مسلمہ تھی، اگر وہ کوئی مشہور خاتون ہوتیں تو اس واقعے میں ان کا نام مذکور ہوتا۔ چونکہ اس میں ان کے نام کا ذکر نہیں کیا گیا اس لیے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کوئی عام مسلمان خاتون تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی نظام میں ایک عام عورت بھی قانون سازی جیسے معاملے میں خلیفہ وقت یعنی اسلامی ریاست کے حکمران اعلیٰ تک کی رائے سے اختلاف کر سکتی اور درست ہونے کی صورت میں اپنی بات منوا سکتی ہے۔ فنی اصطلاح میں کہا جا سکتا ہے کہ حکمران وقت پر خاتون کا اعتراض آئین کی خلاف ورزی کے حوالے سے تھا کیونکہ قرآن اسلامی حکومت اور مسلمانوں کا آئین اور دستور ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اسلام میں عورتوں کو قانون سازی میں بھی حصہ لینے کی اجازت ہے۔ اور یہ حق اسلام نے عورتوں کو چودہ سو سال پہلے ہی عطا کر دیا تھا۔

مسلمان عورتوں نے میدان جنگ میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔ صحیح بخاری میں ایک پورا

باب اس موضوع پر ہے۔ جہاد کے دوران مسلمان عورتیں مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں، انہیں ابتدائی طبی امداد دیتی تھیں۔ عام حالات میں عورتوں کو میدان جنگ میں نہیں جانا چاہیے کیونکہ قرآن کی رُو سے مرد عورتوں کے محافظ ہیں۔اس لیے جہاد مردوں ہی پر فرض ہے۔لیکن جب حالات کا تقاضا ہوتو عورتوں کو بھی جہاد میں حصہ لینے کی اجازت ہے۔ تاہم حالات کا تقاضا ہوتب بھی وہ اسی صورت میں میدان جنگ میں جائیں گی جب وہ خود ایسا چاہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو اسلام میں بھی وہی صورت ہوتی جو آپ امریکہ میں دیکھتے ہیں۔

امریکہ میں عورتیں جنگ سے محفوظ اور مستثنیٰ نہیں ہیں۔ امریکہ میں عورتوں کو جنگی خدمات میں شرکت کی اجازت ۱۹۰۱ء سے حاصل ہے مگر انہیں باقاعدہ عملی جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ صرف نرسوں کی حیثیت سے خدمات انجام دیتی تھیں۔تحریک نسواں کے آغاز کے بعد ۱۹۷۳ء میں اس تحریک نے مطالبہ کیا کہ عورتوں کو عملی جنگ میں حصہ لینے کی اجازت کیوں حاصل نہیں ہے؟ اس بناء پر امریکی حکومت نے عورتوں کو عملی جنگ میں شرکت کی اجازت دے دی۔ اور امریکی محکمہ دفاع کی ایک رپورٹ مجریہ ۲۳ اپریل ۱۹۹۳ء کے مطابق ایک کنونشن میں ۹۰ افراد پر جنسی حملے کیے گئے، ان میں ۸۳ عورتیں تھیں۔ تادیبی کارروائی میں ۱۱۷ افسر ملزم قرار پائے۔ ذرا سوچیے، صرف ایک کنونشن میں ۸۳ عورتیں جنسی زیادتی کا نشانہ بنیں۔ اور ان ۱۱۷ افسروں کا جرم کیا تھا؟ انہوں نے عورتوں کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور انہیں بھاگنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے عورتوں کو قطعی برہنہ حالت میں پریڈ کرنے اور برسر عام جنسی عمل پر مجبور کیا۔ کیا یہی وہ چیز ہے جسے آپ 'حقوق نسواں' کہتے ہیں۔ اس واقعے پر امریکی پارلیمنٹ میں شور ہوا، اور صدر بل کلنٹن کو خود اس پر معذرت کرنی اور یہ کہنا پڑا کہ ''جو کچھ ہوا اس پر ضروری اقدام کیا جائے گا۔'' لہٰذا اسلام میدان جنگ میں عورتوں کو اسی وقت شریک ہونے کی اجازت دیتا ہے جب ایسا کرنا واقعی ضروری ہو۔ لیکن وہاں بھی انہیں اپنے اسلامی لباس اور اسلامی اخلاقیات کی پابندی کرنی ہوگی اور شرم وحیا کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

اگر امریکہ میں اسلامی قانون نافذ ہوتو جب کبھی کسی مرد کی نگاہ کسی عورت پر پڑے گی اور اس کے ذہن میں کوئی غلط خیال آئے گا،تو وہ اپنی نظریں اس منظر سے پھیر لے گا۔ ہر عورت اسلامی لباس پہنے گی جیسا کہ قرآن میں ہدایت دی گئی ہے۔اس کے بعد بھی اگر کوئی مرد کسی عورت سے زیادتی کا مرتکب ہوگا تو اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ذرا سوچیے کہ ان حالات میں امریکہ میں عورتوں سے زیادتی کی شرح بڑھے گی، یکساں سطح پر قائم رہے گی، یا اس میں کمی واقع ہوگی؟ بلاشبہ اسلامی قانون دنیا کے جس حصے میں بھی نافذ ہوگا، وہاں عورتوں کے لیے زندگی محفوظ، آسان اور خوشگوار ہو جائے گی۔

خلاصہ کلام

گفتگو سمیٹے ہوئے ایک مثال کے ذریعے عورت اور مرد کی برابری کا تصور واضح کیا جاسکتا ہے۔فرض کیجیے ایک جماعت میں دو طالب علم الف اور ب امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرتے ہیں۔ دونوں ۸۰ فی صد نمبر لیتے ہیں۔ جب آپ ان کے امتحانی پرچے کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ پرچے میں دس مختلف سوالات تھے۔ ہر سوال دس نمبر کا تھا۔ پہلے سوال میں طالب علم الف نے دس میں سے نو نمبر حاصل کیے اور طالب علم ب نے دس میں سے سات نمبر لیے۔اس لیے پہلے سوال میں طالب علم الف طالب علم ب سے اوپر رہا۔دوسرے سوال میں الف نے دس میں سے سات نمبر جبکہ ب نے نو نمبر حاصل کیے۔اس طرح سوال نمبر دو میں طالب علم ب، الف سے اوپر رہا۔ تیسرے سوال میں دونوں نے دس میں سے آٹھ نمبر پائے اور اس طرح تیسرے سوال میں دونوں برابر رہے۔ جب تمام دس سوالوں کے نمبر جمع کیے گئے تو پتہ چلا کہ الف اور ب دونوں طالب علموں نے ۱۰۰ میں سے ۸۰ نمبر حاصل کیے ہیں، اس طرح مجموعی طور پر دونوں برابر قرار پائے۔ جبکہ الگ الگ دیکھا جائے تو بعض سوالوں میں الف برتر رہا اور بعض میں ب، اور بعض میں دونوں برابر رہے۔

اسی طرح ایک اور مثال اس تناظر میں ملاحظہ کیجیے کہ اللہ نے مردوں کو زیادہ طاقت دی

ہے۔فرض کیجیے آپ کے گھر میں کوئی چور داخل ہوتا ہے۔تو کیا عورتوں اور مردوں کو یکساں تصور کرتے ہوئے آپ نعرہ لگائیں گے کہ میں عورتوں کے حقوق پر یقین رکھتا ہوں اور پھر چور سے نمٹنے کے لیے اپنی ماں، بہن یا بیٹی کو پکاریں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ ایسا نہیں کریں گے بلکہ فطری طور پر چور سے خود ہی مقابلہ کرنے کی کوشش کریں گے۔اگر ضرورت ہوئی تو آپ کے گھر کی خواتین مداخلت کرسکتی ہیں، لیکن چونکہ مرد کو خدا نے زیادہ جسمانی طاقت دی ہے، اس لیے عام حالات میں آپ خود ہی چور سے نمٹنے کی کوشش کریں گے۔اس سے واضح ہے کہ مرد جسمانی طاقت کے اعتبار سے عورت سے ایک درجہ بالاتر ہے۔

آیئے اب ہم ایک اور مثال پر غور کریں جو والدین کے احترام کے حوالے سے ہے۔جیسا کہ ہم نے ایک حدیث نبویؐ میں دیکھا کہ اسلام میں اولاد کی جانب سے ماں کو باپ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ حسن سلوک کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ یہاں عورت مرد سے ایک درجہ بلند ہے۔جبکہ مجموعی طور پر بحیثیت انسان مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔پس اسلام مرد اور عورت کی برابری پر یقین رکھتا ہے یکسانیت پر نہیں کیونکہ وہ خلاف حقیقت ہے۔مرد اور عورت اپنے فطری اختلافات کے باوجود بحیثیت انسان اسلام کی نگاہ میں مجموعی طور پر برابر ہیں۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق کے اہم نکات کا یہ ایک خلاصہ تھا۔اس کے بعد یہ ایک الگ بات ہے کہ مسلمان معاشروں نے کیا کیا یا کیا کررہے ہیں۔ بہت سے مسلمان معاشروں میں عورتوں کو ان کے حقوق نہیں دیے گئے ہیں اور یہ معاشرے قرآن اور سنت سے انحراف کی روش پر گام زن ہیں۔اس کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک مغرب پر عائد ہوتی ہے۔کیونکہ مغرب کے رویے کی وجہ سے بہت سے مسلمان معاشرے حد سے زیادہ محتاط اور اپنے تحفظ کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہوکر ایک انتہا پر چلے گئے اور قرآن و سنت سے انحراف کے مرتکب ہوئے۔دوسری انتہا یہ ہے کہ بعض مسلمان معاشروں نے مکمل طور پر مغربی طور طریقے اپنا لیے اور مغربی کلچر کے نقال اور مقلد بن گئے۔لیکن اگر آپ اسلام میں عورتوں کے حقوق کا تجزیہ قرآن و

سنت کی روشنی میں کریں تو آپ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں بلکہ جدید تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔

عورتوں کے حقوق اور اسلام پر اعتراضات

مغرب میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اسلام پر بعض لگے بندھے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ان میں مرد کے لیے چار شادیوں کی اجازت، وراثت میں عورت کے حصے کا مرد کے حصے سے آدھا ہونا، یا مالی معاملات میں اگر گواہی کے لیے ایک مرد دستیاب نہ ہوتو دوعورتوں کو گواہ بنانے کی ہدایت، نماز میں عورت کی امامت اور اسلام میں عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی گنجائش وغیرہ جیسے معاملات شامل ہیں۔تاہم ان تمام سوالوں کے تسلی بخش جوابات دیے جاچکے ہیں ، ان موضوعات پر متعدد تصانیف موجود ہیں اور مغرب میں اسلام قبول کرنے والی خواتین ان تمام حوالوں سے مطمئن ہونے کے بعد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوتی ہیں۔اختصار کے پیشِ نظر یہاں ان مباحث کو چھیڑنا ممکن نہیں۔

مغربی عورتوں میں اسلام کی مقبولیت کا اصل سبب

اس کتاب میں اب تک جو کچھ پیش کیا گیا اس کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ مغربی عورتوں میں اسلام سے دلچسپی کا اصل سبب یہ ہے کہ مغرب کے برعکس اسلام انہیں مردوں کے مساوی حقوق، ان سے مرد بننے کا مطالبہ کیے بغیر عطا کرتا ہے۔اسلام انہیں تمام حقوق عورت رہتے ہوئے ہی دیتا ہے اور اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ عورت ہونے کا مطلب مرد سے کمتر ہونا نہیں ہے۔اللہ کی نگاہ میں اصل قدر و قیمت ایمان اور اچھے اعمال و کردار کی ہے، مرد ہو یا عورت، اس کسوٹی پر جو بھی پورا اترے گا، اور اپنی ذمہ داریاں درست طور پر ادا کرے گا، اللہ کی رضا و خوشنودی، دنیا اور آخرت کی بھلائیاں اور انعامات اس کے لیے ہیں۔

اسلام پوری انسانیت کا دین

دنیا میں مسلمانوں کے صدیوں سے پستی اور زبوں حالی کی کیفیت میں ہونے کے باوجود دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ اقوام میں اسلام کی یہ مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور ہر انسان کے لیے اس میں فطری طور پر کشش موجود ہے،اسی لیے درحقیقت اسلام ہی پوری انسانیت کا دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں میں تمام تحریفات اور تبدیلیوں کے باوجود آج بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کے آخری رسول اور پوری انسانیت کے تاقیامت راہنما کی حیثیت سے دنیا میں تشریف لانے کی واضح پیشین گوئیاں موجود ہیں، حتیٰ کہ ہندومت کی قدیم کتابوں میں بھی کلکی اوتار کے نام سے جس آخری رسول کی آمد کی خبر دی گئی ہے،اس کی بیشتر نشانیاں مکمل طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق ہوتی ہیں۔

بائبل اور انجیل میں اس حوالے سے جو بشارتیں اب بھی موجود ہیں ان کے بارے میں بہت مواد دستیاب ہے۔ان بشارتوں کا ایک جامع تذکرہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کی پانچویں جلد میں قرآن کی ۶۱ ویں سورۃ ،سورہ صف کی چھٹی آیت کی تشریح میں بھی ملتا ہے۔ جبکہ ہندومت کی قدیم کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں، ان میں آپؐ کے والدین کے عربی ناموں کا سنسکرت کے ہم معنی الفاظ میں ذکر، مقام پیدائش یعنی مکہ مکرمہ کے لیے مقام امن کے ہم معنی لفظ کا استعمال ،اور آپؐ کے اعلیٰ اخلاقی اوصاف اور آپؐ کے ہاتھوں شیطانی طاقتوں کی کامل شکست کا بڑا واضح بیان موجود ہے۔اس موضوع پر الٰہ آباد کی پریاگ یونیورسٹی اور پھر پنجاب کی چندی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ رہنے والے سنسکرت کے عالم اور محقق پنڈت ڈاکٹر وید پرکاش اپادھیائے کی کتاب ''کلکی اوتار اور محمد صاحب'' خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔اس میں دی گئی معلومات کے درست ہونے کی تصدیق ہندو مذہب کے متعدد دوسرے علماء نے بھی کی ہے جن کی آراء کتاب میں شامل ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۰ء میں ہندی زبان میں شائع ہوئی تھی اور اب اس کے اردو ترجمے انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔

اسلام-غیر مسلم دنیا کے غور وفکر کا حق دار

اس کتاب میں اب تک پیش کی گئی معلومات اہل مغرب اور پوری غیر مسلم دنیا سے اسلام کی تعلیمات پر تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر غیر جانبدارانہ غور وفکر کا تقاضا کرتی ہیں۔ ترقی یافتہ مغربی دنیا کے لوگ خصوصاً خواتین، مسلم دنیا کی تمام تر زبوں حالی کے باوجود اگر اس اعلان کے ساتھ اسلام کو اپنا رہے ہیں کہ یہ زیادہ عادلانہ نظام ہے اور اس میں مرد وزن دونوں کے حقوق اور فرائض کی تقسیم اتنی متوازن ہے کہ ایک حقیقی اسلامی معاشرے میں وہ سماجی اور نفسیاتی مسائل جنم نہیں لے سکتے جنہوں نے تمام مغربی معاشروں کو ابتری کا شکار بنا رکھا ہے، پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری رسول اور عالم انسانی کے راہبر ہونے کی گواہی ان کی اپنی مقدس کتابیں بھی دے رہی ہیں تو انہیں سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے اسلام کے بارے میں براہ راست جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

انسانی اتحاد کی حقیقی بنیاد اسلام ہی فراہم کرتا ہے

مغرب اور پوری غیر مسلم دنیا کے اہل فکر ونظر کو اس نکتے پر خاص طور سے غور کرنا چاہیے کہ تمام انسانوں کو ایک خدا کا بندہ اور ایک ماں باپ کی اولاد قرار دینے، کالے اور گورے اور عربی و عجمی سب کو بحیثیت انسان یکساں محترم ٹھہرانے اور انسانوں کے درمیان فضیلت کا معیار صرف کردار کی خوبی کو قرار دینے والا اسلام ہی تمام انسانیت کے اتحاد کی حقیقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قوم، نسل، رنگ، وطن، علاقہ، زبان اور محنت و سرمایہ وغیرہ کی بنیادیں انسانوں کو خود غرض، حریص، سفاک، ظالم اور متحارب گروہوں میں تقسیم کرنے کے سوا کوئی نتیجہ فراہم نہیں کرسکتیں۔ انسانی دنیا اپنے تجربے سے یہ بات جان چکی ہے۔ اس لیے اگر دنیا میں حقیقی امن مطلوب ہے، جو کسی رکاوٹ کے بغیر پورے عالم انسانی کی مسلسل اور ہموار ترقی کا ضامن ہو، تو وہ صرف اسلام ہے۔

اسلام پر مسلمانوں کی اجارہ داری نہیں

اسلام پر مسلمانوں کی اجارہ داری نہیں، یہ پوری انسانیت کا ورثہ ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرنا بھی چنداں دشوار نہیں۔ قرآن اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مستند ترین ذریعہ ہیں۔ قرآن ایک حرف کی تبدیلی کے بغیر تقریباً پندرہ سو سال سے اپنے نزول کی زبان میں مکمل طور پر محفوظ ہے۔ اس کے مستند تراجم اور تفاسیر دنیا کی بیشتر زبانوں میں بآسانی دستیاب ہیں۔ دنیا کا ہر پڑھا لکھا شخص ان ماخذوں کے ذریعے اسلام کے بارے میں براہ راست جان سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے حق حاصل ہے کہ ان باتوں کو قبول کرے یا مسترد کردے۔ پوری دنیا میں اسلام کی حکومت قائم ہوجائے تب بھی کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ قرآن نے اس کی قطعی ممانعت کردی ہے۔

قرآن میں اللہ کا فرمان ہے:

اِنَّ هٰـذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلاً O یعنی ''یہ قرآن تو ایک نصیحت ہے سو جو چاہے اپنے رب تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرلے'' (سورۂ مزمل:۱)، اور یہ کہ:

لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُومِنْ بِّاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ O

یعنی'' دین میں کوئی زور زبردستی نہیں، صحیح بات غلط خیالات اسے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے، اس لیے اب جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسے مضبوط سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ (البقرہ:۲۵۶)۔

موجودہ حالات اور امت مسلمہ

اب تک ہم نے اس مطالعہ میں دیکھا ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر زبوں حالی کے باوجود ایک طرف ترقی یافتہ اقوام میں اسلام کی مقبولیت، دین فطرت کے اپنے اوصاف اور کشش کی بنیاد پر مسلسل بڑھ رہی ہے اور دوسری جانب اللہ کے اس پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں تک پہنچانے کے

لیے مبعوث کیے جانے والے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہستی ہیں جن کے بارے میں قدیم مذاہب کے ماننے والوں کو خود ان کی مذہبی کتابوں میں کھلی خوش خبریاں دی جا چکی ہیں جن کی بناء پر نبی اکرمؐ کی شخصیت، پوری انسانیت کے لیے فرماں روائے کائنات کے مقرر کردہ رہنما کی حیثیت سے اُن کے لیے ہرگز اجنبی نہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہ حالات خصوصاً ترقی یافتہ مغربی ملکوں کی خواتین میں اسلام کی روز افزوں مقبولیت دنیا کے مسلمانوں کو کیا مواقع مہیا کر رہی ہے اور اس صورت حال میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آئندہ باب میں ہم اسی بات کا جائزہ لیں گے۔

..................حواشی..................

۱- سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، پردہ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، نومبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۶-۲۰۷

۲- یہ حصہ ڈاکٹر ذاکر نائیک کے ایک لیکچر سے مستفاد ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھیے:

http://www.institutealislam.com/womens-rights-in-islam-modernising-or-outdated-part-one-by-dr-zakir-naik/

باب ششم

خواتین اور مسلم معاشرہ

دور جدید میں مسلمان خواتین اپنا سماجی کردار کیسے ادا کریں

اس مطالعے میں اب تک پیش کی گئی معلومات سے واضح ہے کہ مغربی خواتین میں اسلام قبول کرنے کا رجحان اس حقیقت کے باوجود روز افزوں ہے کہ پورے کرۂ ارض پر کہیں بھی ایسا مسلم معاشرہ موجود نہیں جو اسلامی تعلیمات کا حقیقی نمونہ ہو اور جس میں دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی میں قرآن وسنت کے احکام پر عمل درآمد کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی وہ مقام و مرتبہ اور وہ تمام حقوق حاصل ہوں جن کی ضمانت اسلام دیتا ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم نے دیکھا کہ اسلام کو اپنانے والی مغربی خواتین کا کہنا بھی یہی ہے کہ موجودہ مسلمان معاشروں میں عورتوں کے ساتھ بعض بے انصافیوں سمیت پائی جانے والی خرابیاں اسلامی تعلیمات پر عمل کا نہیں بلکہ ان سے انحراف اور مختلف ملکوں کے مقامی کلچر کو اپنا لینے کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے انہوں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ مسلمانوں کے عمل و کردار کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن وسنت میں پائے جانے والے اصل اسلام کو جاننے اور سمجھنے کے بعد کیا ہے۔

مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ

مسلمان ہونے کا فیصلہ کرنے والی مغربی خواتین کا یہ اظہار حقیقت پوری مسلم دنیا کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر موجودہ مسلمان معاشرے اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ بن جائیں تو دنیا میں اسلام کی روشنی کے پھیلنے کی رفتار کئی گنا بڑھ سکتی ہے۔ قرآن کی رو سے امت مسلمہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے اُس حق کی گواہ ہے جو اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی نظام حیات کی صورت میں اسے پہنچایا ہے۔ اس بناء پر دنیا کے سامنے اسلام کا عملی

نمونہ پیش کرنا مسلمانوں کا فرض منصبی ہے۔ ایسا نہ کرنے کی وجہ سے دنیا کے جو لوگ اسلام کی روشنی سے محروم رہیں گے، روزِ حساب مسلمان بحیثیت امت اس بارے میں جوابدہ ٹھہرائے جائیں گے۔ اس لیے یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ نہایت سنجیدہ معاملہ ہے۔ خصوصاً اجتماعی و سماجی زندگی میں خواتین کے کردار کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایسا ماڈل وضع کرنا جو جدید زندگی کے جائز تقاضوں سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہو، وقت کی انتہائی اہم ضرورت ہے۔ ایسے کسی ماڈل کی تیاری کے لیے نہ مسلم حکومتوں کی جانب سے اب تک کوئی شعوری کاوش کی گئی ہے، نہ مسلمان معاشروں میں سرگرم سماجی، سیاسی اور مذہبی عناصر ایسا کوئی ماڈل سامنے لا سکے ہیں لہٰذا اس جانب فوری توجہ دی جانی چاہیے۔

سماجی سطح پر اصلاحی اقدامات کی ضرورت

مکمل اسلامی نظام بلاشبہ حکومت و ریاست کو شریعت کے سانچے میں ڈھالے بغیر برپا نہیں ہوسکتا اور اس کے لیے اقتدار کی طاقت ناگزیر ہے۔ متعدد اسلامی ملکوں میں اسلامی تحریکیں اس مقصد کے لیے ابلاغ و دعوت کے ذریعے سرگرم عمل ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کے خاتمے کے بعد اب سرمایہ دارانہ نظام بھی اپنے ہی تضادات کی بناء پر ناکامی سے دوچار ہے جبکہ اس نظریاتی خلاء میں صدیوں کے انحطاط کے بعد اسلام از سرنو ایک قطعی معقول و منطقی فلسفہ حیات اور جامع و مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے ایک نئی قوت بن کر ابھر رہا ہے۔

پوری دنیا خصوصاً ترقی یافتہ ملکوں میں قبول اسلام کا بڑھتا ہوا رجحان اور کئی عرب ریاستوں میں عوام کی بھرپور تائید سے عشروں طویل سیکولر آمریتوں کا خاتمہ اور اسلامی فکر کے حامل عناصر کی انتخابی فتوحات اس حقیقت کے روشن مظاہر ہیں۔ لیکن حقیقی اور مثالی اسلامی معاشرہ کے قیام میں ابھی کتنا وقت اور لگے گا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم معاشرتی سطح پر خاندانی نظام کے استحکام اور عائلی زندگی کی بہتری کے لیے بیشتر اسلامی احکام پر عمل اور غیر اسلامی طریقوں سے اجتناب اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں بھی ممکن ہے۔ اس لیے کم از کم اس حد تک اپنی

ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کو نتیجہ خیز عملی اقدامات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیے۔

مسلم دنیا اور مغرب میں خاندان کے ادارے کی کیفیت

یہ امر باعث اطمینان ہے کہ مسلمان معاشروں میں خاندانی نظام اب بھی بڑی حد تک محفوظ ہے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں سب کے لیے بالعموم پرسکون گھر کی نعمت برقرار ہے اور ماں باپ مل جل کر بچوں کی پرورش کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں اور دوسری جانب بچے بڑے ہو کر ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل ہوں تو والدین کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جبکہ مغرب میں خاندان کا ادارہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا ہے اور ایسی عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہیں روزی کمانے کی جدوجہد اور بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بوجھ تنہا اٹھانا پڑتا ہے۔ اس صورت حال نے وہاں ''سنگل پیرنٹ'' کی اصطلاح کو جنم دیا ہے جن میں بھاری اکثریت عورتوں کی ہوتی ہے۔

بی بی سی کی ویب سائٹ پر ۱۱ اپریل ۲۰۰۷ء کو برطانیہ کے قومی شماریاتی ادارے (آفس آف نیشنل اسٹیٹسٹکس) کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی روشنی میں "One-parent families on the rise" کے عنوان سے جاری کی جانے والی ایک رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں صرف ماں یا صرف باپ کے ساتھ رہنے والے بچوں کی تعداد ۱۹۷۲ء کی نسبت ۲۰۰۷ء میں تین گنا ہو چکی تھی۔ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ ۲۰۰۶ء میں ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنے والے بچوں کا تناسب برطانوی بچوں کی کل تعداد کے ایک چوتھائی تک پہنچ چکا تھا جبکہ ان میں سے ۹۰ فی صد بچے صرف ماؤں کے ساتھ رہتے تھے۔

مغربی تہذیب کے دوسرے بڑے مرکز امریکہ میں بھی کم و بیش یہی صورت ہے۔ یو ایس سنسس بیورو کی جانب سے نومبر ۲۰۰۹ء میں "Custodial Mothers and Fathers and Their Child Support: 2007" کے عنوان سے جاری کی جانے والی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۷ء میں امریکہ میں ۷ء۱۳ ملین عورتیں اور مرد ۸ء۲۱ ملین بچوں کی ''تنہا والدین'' کی

حیثیت سے پرورش کر رہے تھے۔صرف ماں یا صرف باپ کی نگرانی میں پرورش پانے والے بچوں کی تعداد اس وقت امریکی بچوں کی مجموعی تعداد کا ۳ء۲۶ فی صد تھی جبکہ تنہا والدین میں عورتوں کا تناسب ۸۴ فی صد اور مردوں کا صرف ۱۶ فی صد تھا۔

ان اعداد و شمار سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خاندان کا ادارہ مغرب میں کس درجہ شکست و ریخت کا شکار ہے اور اس کے نتیجے میں عورتوں پر ذمہ داری کا بوجھ کس طرح بڑھتا چلا جارہا ہے۔اس کیفیت کا ایک بڑا سبب باقاعدہ شادی کے بندھن کے بجائے گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز کی حیثیت سے وقتی پارٹنر شپ کا رواج ہے چنانچہ بی بی سی کی مذکورہ بالا رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں شادی کے بغیر ہونے والے بچوں کا تناسب ۲۰۰۷ء میں ۴۴ فی صد تک پہنچ چکا تھا جبکہ انیس سوستر کی دہائی میں یہ تناسب ۱۲ فی صد تھا۔ اس طرح کے صنفی تعلق میں اول تو مرد اور عورت دونوں اولاد سے بچنے کے خواہشمند ہوتے ہیں لیکن اولاد ہو ہی جائے تو عموماً وہ عورت ہی کی ذمہ داری قرار پاتی ہے ۔ باقاعدہ شادیوں کے بعد بھی طلاق اور علاحدگی کی مسلسل بڑھتی ہوئی شرح اولاد کے حوالے سے عورت ہی کی ذمہ داری بڑھانے کا باعث بن رہی ہے۔ان حالات میں بچوں ،عورتوں اور مردوں سب کو جن نفسیاتی مسائل کا سامنا ہے،مغربی معاشروں اور ان کی تقلید میں مبتلا مسلمان معاشروں کے اعلیٰ طبقات میں ان کا اظہار ذہنی واعصابی امراض میں روزافزوں اضافے کی شکل میں بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

مسلم دنیا میں خاندان کے ادارے کو درپیش چیلنج

مغرب کی اس ابتر صورت حال کے مقابلے میں مسلم دنیا میں گھر اور خاندان کے ادارے ابھی بڑی حد تک مستحکم ہیں ، نکاح کر کے باقاعدہ گھر بسانا اور ماں باپ دونوں کا مشترکہ طور پر اولاد کی پرورش کرنا ہی عام طریقہ ہے ۔ نیز والدین، بہن بھائیوں اور دوسری رشتہ داریوں کا لحاظ اور احترام بھی مسلم معاشروں میں مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ دنیا میں کہیں بھی مثالی اسلامی معاشرہ موجود نہ ہونے کے باوجود مسلم دنیا میں خاندان کے ادارے کا بڑی حد تک

استحکام اور اسلام کی عائلی اقدار کا کسی نہ کسی درجے میں برقرار رہنا، مغربی عورتوں کو اسلام کی جانب مائل کرنے کا ایک اہم سبب ہے۔ تاہم مغربی تہذیب سے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبے متاثر ہوئے ہیں، اسی طرح خاندانی نظام میں بھی کمزوری آنا شروع ہوگئی ہے۔

مغرب میں عورتوں کی معاشی جدوجہد میں بڑے پیمانے پر شمولیت کے لیے گھر سے باہر نکل کر کارگاہوں، دفاتر اور بازاروں کا رخ کرنا ہی خاندانی نظام کے بکھرنے کا بنیادی سبب بنا ہے۔ وقت کے تقاضوں کی بناء پر اب مسلمان معاشروں میں بھی عورتوں کے لیے معاشی جدوجہد میں شمولیت کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے۔ طرز زندگی میں آنے والی تبدیلیوں اور مہنگائی میں مسلسل اضافے نے ایک خاندان کے لیے ایک شخص کی کمائی کو اکثر صورتوں میں ناکافی بنادیا ہے۔ نیز پوری مسلم دنیا میں تعلیم کے میدان میں بھی خواتین مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں اور جدید علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں مہارت حاصل کررہی ہیں۔ ان اسباب کے فطری نتیجے کے طور پر مسلم خواتین حصول معاش کے لیے بہت بڑے پیمانے پر مختلف پیشے بھی اپنارہی ہیں۔ خواتین کا معاشی سرگرمیوں میں شریک ہونا اسلامی تعلیمات کے منافی ہرگز نہیں ہے لیکن اس عمل میں معاشرتی زندگی کے لیے اسلام کے مقرر کردہ حدود کا لحاظ رکھا جانا لازمی ہے۔

اسلامی تاریخ کے اولین ادوار میں اسلام کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کے ساتھ خواتین کی معاشی سرگرمیوں میں شمولیت کی بہت سے مثالیں موجود ہیں۔ اگلے صفحات میں نمونے کے طور پر ان میں سے بعض کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم یہاں اس جانب توجہ دلانا مقصود ہے کہ اسلام کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان معاشروں میں بھی خاندانی سطح پر وہ خرابیاں تیزی سے بڑھ رہی ہیں جنھوں نے مغرب میں خاندان کے ادارے کی تباہی میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ تعلیمی اداروں اور پھر دفاتر اور کارگاہوں میں آزادانہ اختلاط مردوزن' ذرائع ابلاغ کی حیاسوز پالیسیوں، سوشل میڈیا کی صورت میں موبائل فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے چوبیس گھنٹے باہمی رابطوں کے کھلے مواقع، اس کے ساتھ ساتھ مسلم معاشروں میں مقامی ثقافتوں کے زیر

اثر رائج غیر منصفانہ اور ظالمانہ رسوم ورواج اور ان کے سبب جنم لینے والی بے اطمینانی ، یہ سب عوامل خاندان کے ادارے کو کمزور کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

ان حالات میں ضروری ہے کہ مسلمان خاندان کے ادارے کو منتشر ہونے سے بچانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات میں عمل میں لائیں اور آج کے حالات کے مطابق اجتماعی وسماجی زندگی میں خواتین کے کردار کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک قابل عمل ماڈل وضع کریں۔ خاندان کے ادارے کو مغرب کے انجام سے بچانے اور معاشی جدوجہد میں عورتوں کی شمولیت اور اجتماعی زندگی کے دیگر شعبوں میں ان کے کردار کی ادائیگی کے لیے اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا کچھ کیا جانا چاہیے، ذیل میں اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خاندانی نظام کا استحکام

خاندان کے ادارے کو مستحکم بنانے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس حوالے سے اکثر مسائل کا حل انسانی ذہن اور رویوں کی اصلاح اور تبدیلی پر منحصر ہے۔ اس پس منظر میں معاشرے میں سرگرم وہ تمام ادارے نہایت اہمیت کے حامل ہیں جو ذہن سازی اور رویوں کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان اداروں میں اہم ترین ذرائع ابلاغ، تعلیمی نظام و نصاب اور مساجد ہیں۔ ان کے علاوہ ملکی قوانین، رائے عامہ تشکیل کرنے والی تنظیمیں اور ادارے، معاشرے میں اعلیٰ مقام ومرتبہ پر فائز شخصیات (رول ماڈلز) اور خود خاندان کے ارکان کا کردار بھی لائقِ توجہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام اداروں کا بحیثیت مجموعی خاندان کے ادارے کی اہمیت پر متفق ہونا اور اس کے استحکام اور تحفظ کے لیے اپنے اپنے دائرے میں سرگرم ہونا معاشرے اور خاندان کے لیے کوئی اصلاحی پروگرام وضع کرنے میں معاون ہوسکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ادارے اگر خاندان کے ادارے کو اہمیت نہ دیں یا اس حوالے سے اُن کی سوچ اور سمت میں فرق ہو تو اس کے اثرات بالآخر معاشرتی انتشار کی صورت میں نمایاں ہوں گے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس وقت اکثر مسلم معاشرے کم وبیش اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں — اصلاحِ احوال کا آغاز اس پہلو کی درست

اور گہری تفہیم سے ہوگا۔[1]

غیر اسلامی رسوم و رواج کے خاتمے کی تحریک

مسلمان معاشروں میں مقامی ثقافتوں کے زیر اثر یا معاشرے کے با اثر طبقوں کے مفادات کی تکمیل کے لیے بہت سے جاہلانہ اور غیر اسلامی طور طریقے رائج ہیں۔ مثلاً پاکستان میں وٹہ سٹہ، کاروکاری، قرآن سے شادی، عورتوں کو وراثت میں حصہ نہ دینا، عزت کے نام پر قتل، لڑکیوں کی شادی میں ان کی رضامندی کو لازمی تصور نہ کرنا، دولہا اور اس کے گھر والوں کی طرف سے جہیز کا مطالبہ، بیوی کا مہر ادا نہ کرنا، بتیس روپے آٹھ آنے کو شرعی مہر قرار دینا، مردوں کا خود بے کار بیٹھے رہنا اور عورتوں کو روزی کمانے پر مجبور کرنا، یہ سب ایسے طریقے ہیں جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں مگر یہ صدیوں سے رائج ہیں اور ان کے خلاف کوئی طاقتور اصلاحی تحریک شروع نہیں کی جا سکی ہے۔ پاکستان میں ملک کے قیام کے بعد آئین و دستور کی حد تک اسلامی قوتوں نے بڑی کامیاب جدوجہد کی لیکن معاشرے میں رائج ان غیر منصفانہ اور ظالمانہ رسوم و رواج کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے اور عوام کی ذہنی تربیت کے لیے نہ سیاسی جماعتوں، عوامی تنظیموں اور ذرائع ابلاغ نے کوئی قابل ذکر جدوجہد کی نہ علمائے کرام اور دینی طبقوں کی طرف سے اس سمت میں کسی منظم اور پرعزم تحریک کا آغاز ہوسکا۔ اس اہم کام کو اب مزید نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے اور معاشرتی اصلاح کی ایک بھرپور اور منظم تحریک جلد سے جلد شروع کی جانی چاہیے۔ دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی اس جانب فوری توجہ دی جانی چاہیے۔ اس کے نتیجے میں ایک طرف گھر اور خاندان کی سطح پر مسلمان معاشروں کے حالات بہتر ہوں گے اور یوں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام کی پیش رفت کے لیے راہ ہموار ہوگی اور دوسری جانب پوری دنیا کے سامنے بھی اسلام کے عائلی نظام کا، غلط طور پر اسلام کے کھاتے میں ڈال دی جانے والی مقامی ثقافتی خامیوں سے پاک، زیادہ سے زیادہ حقیقی نمونہ پیش کیا جا سکے گا۔

سادگی کی مہم

معاشرے میں خاندانی نظام کو لاحق خطرات کی ایک بڑی وجہ مادیت پرستی اور نمود و نمائش پر مبنی کلچر ہے۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے سادہ طرزِ زندگی اختیار کرنے کی ایک غیر معمولی اور مسلسل مہم کی ضرورت ہے۔ ملک میں رائج سرمایہ دارانہ نظام اور باوسائل اداروں کے تجارتی مفادات کے تناظر میں حکومتی سطح پر اس نوعیت کی کوئی بڑی مہم شروع کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ تاہم خاندان، کمیونٹی اور سماجی و ثقافتی سطح پر فعال تنظیمیں اس سلسلہ میں مؤثر پروگرام ترتیب دے کر مثبت تبدیلی کی راہ ہموار کرسکتی ہیں۔

سادگی کو ہر سطح پر بالعموم اور لباس اور زیورات کے معاملہ میں بالخصوص رواج دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے معاشرے میں بااثر اور متمول افراد خود ایک مثال قائم کریں۔ نکاح کو آسان بنانے کے لیے اس سے منسلک غیر ضروری اور فضول خرچی کی رسوم کو ختم کیا جائے۔ ہر طرح کی نمود و نمائش کی حوصلہ شکنی اور سادگی کی ہر سطح پر حوصلہ افزائی کی جائے۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اشتہارات کی پالیسی پر نئے سرے سے غور کیا جائے اس وقت ان اشتہارات کا محور بناؤ سنگھار، پرتعیش کلچر اور غیر ضروری اشیاء کو ضروریاتِ زندگی کے طور پر پیش کرنا ہے، اس کے منفی اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔

سادہ زندگی کو فروغ دینے کے لیے مختلف سطحوں پر قانون سازی کے امکانات پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک خاص حد سے زائد سائز کے پلاٹوں، عالی شان مکانات کی تعمیر اور بڑی اور پرتعیش کاروں کے استعمال پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔[۲]

ذرائع ابلاغ کا کردار

رائے عامہ اور رویوں کی تشکیل میں ذرائع ابلاغ کا کردار ہمیشہ سے بہت اہم رہا ہے۔ ابلاغی ٹیکنالوجی میں پیدا ہونے والی تیز رفتار ترقی نے اس کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ کیا ہے۔ مسلم

دنیا کے ذرائع ابلاغ کو بھی سماجی بہتری کی اس تحریک کے مقاصد میں شامل کرنے کی کوشش ہونا چاہیے۔ اس کے لیے بات چیت کے ذریعے بھی ذرائع ابلاغ کے ذمہ داروں کو احساس دلانا چاہیے کہ تجارتی و کاروباری مفادات پر معاشرتی و اخلاقی اقدار کو قربان کرنے کی بجائے تخلیقی انداز اختیار کرتے ہوئے اسلامی معاشرتی اقدار کو اجاگر اور مستحکم کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ مناسب اور معقول حکمت عملی کے ساتھ قانون سازی اور موجود قوانین پر عمل درآمد کے لیے عوامی دباؤ بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ نجی شعبے کے احساس ذمہ داری رکھنے والے باوسیلہ افراد کو ایسے ذرائع ابلاغ کو متعارف کرانے کا بیڑہ اٹھانا چاہیے جو ایک طرف معیار میں کسی سے کم نہ ہوں اور دوسری طرف اپنے پروگراموں اور اشتہارات وغیرہ میں اخلاقی حدود کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوں۔ جبکہ معاشرے میں اسلام کے حقیقی فہم، خدا اور رسول سے محبت اور آخرت کی جوابدہی کے احساس کو پروان چڑھا کر مسلمان نوجوانوں کو ایمانی اعتبار سے اتنا مضبوط بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے کہ وہ شیطانی ترغیبات کا مقابلہ کرنے کے اہل ہو جائیں۔ الحمدللہ مسلمان معاشروں میں آج بھی ایسے نوجوان مرد و زن بڑی تعداد میں موجود ہیں جو تمام ترغیبات کے باوجود اخلاقی حدود کی مکمل پاسداری کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں حجاب کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اسی طرح روزہ، نماز اور دیگر اسلامی احکام پر عمل پیرا طلبہ بھی مسلم دنیا کے تعلیمی اداروں ہی میں نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ اس سمت میں مزید منظم کوشش ان نتائج کو کئی گنا بہتر بنا سکتی ہے۔

مسجد سے تعلق بڑھانے کی ضرورت

اس مقصد کے لیے مسجد سے تعلق بہت ضروری ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ مسجد محض نماز کی ادائیگی کا مقام نہ ہو بلکہ کسی باعمل، غیر متعصب اور کشادہ دل عالم دین کی نگرانی میں دینی تربیت گاہ بھی ہو۔ تاہم پاکستان سمیت بہت سے مسلم ملکوں میں خواتین کا مسجد سے رابطہ بالکل ممنوع ٹھہرادیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بازاروں میں واقع مساجد میں بھی خواتین کے لیے نماز اور وضو وغیرہ کے

لیے کوئی سہولت مہیا نہیں کی جاتی۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ عرب ممالک کی مساجد اور مغرب کے اسلامی مراکز میں خواتین کے لیے دینی رہنمائی کے ساتھ ساتھ اُن کے لیے دیگر تمام سہولتوں کا بھی بندوبست ہوتا ہے اور اس کے مفید نتائج سب کے سامنے ہیں۔ اس لیے ان ملکوں میں جہاں خواتین کے مساجد میں داخلے پر عملاً پابندی ہے، اس پابندی کو ختم ہونا چاہیے اور شریعت کی دی ہوئی رعایات اور جدید زندگی کے تقاضوں کی روشنی میں علمائے کرام کو اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

خواتین کی تعلیم ۔ قابل توجہ پہلو

خواتین کی تعلیم کے حوالے سے مسلم دنیا میں ایک طرف ایسے لوگ ہیں جو سرے سے لڑکیوں کو جدید علوم کی تعلیم دینے ہی کے مخالف ہیں اور دوسری طرف اب درس گاہوں میں لڑکیاں ان شعبوں میں بھی لڑکوں سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں زیر تعلیم ہیں جو خالص مردوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں۔ افراط وتفریط پر مبنی ان رویوں میں اعتدال پیدا کرنا ضروری ہے۔ خواتین کو اپنے فطری دائرہ کار کے مطابق عملی زندگی میں خانہ داری اور بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت کی جن ذمہ داریوں کی ادائیگی کرنی ہوتی ہے، ان کی تعلیم وتربیت میں ان ذمہ داریوں کو بھی ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ایسے مضامین مختص کیے جانے چاہییں جن میں سند لینے کے بعد وہ اگر عملی زندگی میں معاشی جدوجہد کرنا چاہیں تو اس کے لیے مخلوط ماحول میں کام کرنا ضروری نہ ہو۔

خواتین کے لیے طب، تدریس، ہوم اکنامکس وغیرہ کے روایتی مضامین کے علاوہ اب جدید ٹیکنالوجی نے کئی اور ایسے شعبوں کے دروازے بھی کھول دیے ہیں جن میں مہارت حاصل کر کے وہ گھر بیٹھے روزی کما سکتی ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے اس نوعیت کے روزگار کے بے شمار مواقع پیدا کر دیے ہیں۔ لڑکیوں کو ان شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جانی چاہیے۔ مخلوط تعلیمی ادارے اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتے، لہٰذا مسلم ممالک کی حکومتوں کو لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ہر سطح پر جداگانہ تعلیمی ادارے قائم کرنے چاہییں اور اس کے ساتھ ساتھ نجی شعبے کو اس سمت میں مزید پیش قدمی کرنی چاہیے۔

تعلیم کے میدان میں اصلاح کی دیگر کوششوں کے ساتھ ساتھ خاندانی نظام اور عائلی زندگی کے مسائل کے حوالے سے خاص طور پر توجہ دی جائے تا کہ طلبہ و طالبات خاندان اور سماجی اقدار کے موضوعات پر درجہ بہ درجہ ضروری معلومات اور رہنمائی حاصل کر سکیں۔ بہتر ہوگا کہ ابتدائی درجات میں الگ مضمون پڑھانے کے بجائے اسے دوسرے مضامین میں سمو دیا جائے اور میٹرک اور اس سے بعد کے مراحل میں اسے ایک علاحدہ مضمون کے طور پر شاملِ نصاب کیا جائے۔ واضح رہے کہ خاندان اور سماجی اقدار پر مبنی اس مضمون اور معلومات سے قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ جنسی تعلیم یا خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کو مغربی انداز سے متعارف کرایا جائے۔[۳]

خواتین اور حصول معاش کی جدو جہد

یہ بات اگر چہ درست ہے کہ اسلام عورتوں پر معاشی جدو جہد کی ذمہ داری عائد نہیں کرتا لیکن یہ ان کے لیے ممنوع بھی نہیں ہے بلکہ اسے پسند کیا گیا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ایک بہت چشم کشا اور بصیرت افروز واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید جلال الدین انصر عمری اپنی کتاب ''عورت اسلامی معاشرے میں'' سنن ابوداؤد کتاب الطلاق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میری خالہ کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی۔ (طلاق کے بعد ان کو عدت کے دن گھر ہی میں گزارنے چاہیے تھے لیکن عدت کے دوران ہی میں) انہوں نے اپنے کھجور کے چند پیڑ کاٹنے (اور فروخت کرنے) کا ارادہ کیا تو ایک صاحب نے سختی سے منع کیا (کہ اس مدت میں گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے)۔ یہ خاتون حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں استفسار کے لیے گئیں تو آپؐ نے جواب دیا ''کھیت جاؤ اور اپنے کھجور کے درخت کاٹو (اور فروخت کرو) اس رقم سے بہت ممکن ہے کہ تم صدقہ و خیرات اور کوئی بھلائی کا کام کر سکو (اس طرح یہ تمہارے لیے اجرِ آخرت کا سبب ہوگا)۔ یوں ان الفاظ کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ کی خالہ کو انسانیت کی بہی خواہی اور فلاح و بہبود کی

ترغیب دی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت عورت کو اس قابل دیکھنا چاہتی ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خدمت کر سکے اور اس کے ہاتھوں بھلے کام انجام پائیں۔'' (عورت اسلامی معاشرے میں، ص :۱۲۲-۱۲۳)۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ عدت میں جب کسی غیر معمولی ضرورت کے بغیر عورت کا گھر سے باہر نکلنا ممنوع باور کیا جاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان خاتون کو اپنی معاشی ضرورت کی تکمیل کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔

ایسی متعدد مثالوں میں سے ایک اور مثال جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ محترمہ کی ہے۔مولانا جلال الدین انصر عمری اپنی مذکورۂ بالا کتاب میں طبقات ابن سعد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی بیوی صنعت وحرفت سے واقف تھیں۔اس کے ذریعے اپنے اور اپنے خاوند اور بچوں کے اخراجات بھی پورے کرتی تھیں۔ ایک دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر انہوں نے عرض کیا: میں ایک کاریگر عورت ہوں، چیزیں تیار کر کے فروخت کرتی ہوں (اس طرح میں تو کما سکتی ہوں لیکن) میرے شوہر اور بچوں (کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے اس لیے اُن) کے پاس کچھ نہیں ہے۔اس کے بعد انہوں نے رسالت مآب سے دریافت کیا کہ کیا وہ ان پر خرچ کرسکتی ہیں۔آپؐ نے جواب دیا: ہاں تم کو اس کا اجر ملے گا۔'' (ایضاً، ص:۱۲۶-۱۲۷)۔

دور اول کے ان نظائر سے پوری طرح عیاں ہے کہ اسلام میں عورتوں کو معاشی جدوجہد میں شرکت سے نہ صرف یہ کہ روکا نہیں گیا بلکہ اسے پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔اس لیے آج کے طرز زندگی میں جب ایک طرف خاندان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے اضافی وسائل کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے، اور دوسری طرف مسلمان خواتین مختلف شعبوں میں تعلیم وتربیت کے ذریعے معاشی جدوجہد میں شرکت کی صلاحیت بھی حاصل کررہی ہیں ، اور گھر داری کی جدید مشینی سہولتوں کی بناء

پر ان کے پاس اتنا وقت بھی ہے کہ وہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ کسبِ معاش کے لیے بھی وقت نکال سکتی ہیں تو ضروری ہے کہ انہیں اسلام کی مقرر کردہ حدود میں اس کی بہتر سے بہتر سہولتیں فراہم کی جائیں۔

جدید مسلم معاشرے میں خواتین کے لیے روزگار کے مواقع

خواتین کی تعلیم ، صلاحیتوں اور مختلف میدانوں میں ان کی مہارت سے قومی سطح پر فائدہ اٹھانے کے لیے دور جدید کے اسلامی معاشرے میں کیا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے، یہ سوال مسلم دانشوروں سے سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اسے حل کرنے کی بعض ممکنہ صورتوں میں سے ہمارے نزدیک ایک یہ ہے کہ پرائمری اسکول تک تدریس کا سارا کام خواتین کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کے بعد طلبہ و طالبات کے لیے الگ الگ تعلیمی ادارے ہوں۔ طالبات کے تعلیمی اداروں میں یونیورسٹی اور پیشہ ورانہ کالجوں کی سطح تک خواتین ہی تدریس کا کام انجام دیں۔ اسی طرح خواتین کے الگ اسپتال بھی ان کے لیے جداگانہ روزگار کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ معیشت میں خدمات کے شعبہ (Services Sector) کی اہمیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اس شعبہ میں خواتین کے لیے تعلیم اور کام کے مواقع فراہم کیے جانے چاہییں۔ پاکستان میں ویمن بینک کا تجربہ اس سمت میں ایک اچھی مثال تھا ، دیگر شعبوں میں بھی ایسے تجربات کیے جائیں اور انہیں ان کی حقیقی روح کے مطابق آگے بڑھایا جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ خواتین کے اپنے بازار مینا بازاروں کی شکل میں کامیابی سے چل رہے ہیں، ان سے نہ صرف خواتین کو روزگار حاصل ہوتا ہے بلکہ خریدار خواتین بھی بسہولت خریداری کر سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں مزید پیش رفت کے وسیع مواقع موجود ہیں۔ بہتر سہولتوں کے ساتھ ایسے بازاروں کو مستحکم بنایا جانا چاہیے اور ان کی تعداد میں اضافہ کیا جانا چاہیے۔ خواتین کے انڈسٹریل ہومز کے تجربات بھی بہت کامیاب رہے ہیں۔ کم پڑھی لکھی خواتین بھی مختلف دستکاریوں کی تربیت حاصل کر کے اپنی روزی خود کما سکتی ہیں۔ ان دستکاریوں کی اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی مارکٹنگ کا بہتر انتظام کر کے بہت بڑی تعداد میں خواتین کو

محفوظ روزگار فراہم کیا جاسکتا ہے۔چین اور جاپان سمیت دنیا کے مختلف ملکوں سے اس قسم کا سامان بہت بڑی مقدار میں برآمد کیا جاتا ہے۔مسلم ممالک کے لیے بھی اس کے وسیع مواقع موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے خواتین کے لیے روزگار کے بہت سے نئے مواقع پیدا کردیے ہیں، مناسب تربیت حاصل کر کے مسلمان خواتین ان سے بھرپور استفادہ کرسکتی ہیں اور مخلوط ماحول سے محفوظ رہ کر اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کی آمدنی اور قومی آمدنی میں معقول اضافہ کرسکتی ہیں۔

پالیسی کے طور پر عام دفاتر یا کارگاہوں میں خواتین کے بیٹھنے اور کام کرنے کی جگہ مردوں سے الگ رکھنے کا اہتمام کیا جائے تو اس سے مجموعی اخلاقی ماحول بہتر بنانے میں مدد ملے گی، خواتین زیادہ احساسِ تحفظ پائیں گی جس کے نتیجے میں ان کے کام کے معیار اور رفتار میں بہتری آئے گی۔ انتظامی لحاظ سے ادارے یا دفتر کے کسی ایک یا چند مخصوص شعبوں کا تمام کام صرف خواتین کے حوالے ہوتو توقع ہے کہ مقابلتاً اس شعبہ میں معیار میں بہتری کے ساتھ ساتھ مقدار میں بھی زیادہ کام ہوگا۔

مسلمان خواتین کے لیے جدید دور میں اسلام کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے اپنا سماجی کردار ادا کرنے کے حوالے سے یہ چند باتیں مسلم دنیا کی حکومتوں، اہل علم و دانش اور غیر سرکاری سطح پر سرگرم تنظیموں اور اداروں کے لیے دعوت فکر کی حیثیت رکھتی ہیں۔مسلم دنیا کو اپنی اجتماعی دانش سے اس مقصد کے لیے مکمل اور جامع لائحہ عمل طے کرنا چاہیے تا کہ نہ صرف مسلم ممالک بلکہ مغربی دنیا کی ان خواتین کو بھی رہنمائی مل سکے ،اسلام کے نظام عدل و رحمت نے جن کے دل جیت لیے ہیں اور جو ایسے ماڈل کی تلاش میں ہیں جسے اپنا کر وہ اسلام پر کاربند رہنے کے ساتھ ساتھ جدید زندگی کے تقاضوں کی تکمیل بھی کرسکیں۔

..................حواشی..................

۱- خاندان کا ادارہ: درپیش چیلنج، ص ۲۹

۲- ایضاً، ص ۳۴

۳- ایضاً، ص ۳۳-۳۴

کتابیات

اُردو مآخذ:

- اصلاحی، امین احسن۔ اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام۔ لاہور: فاران فاؤنڈیشن۔
- آفندی، فرید وجدی، ترجمہ ابوالکلام آزاد۔ مسلمان عورت۔ لاہور: داتا پبلشرز، ۱۹۷۸ء۔
- خان، وحیدالدین۔ علم جدید کا چیلنج۔ کراچی: مجلس نشریات اسلام۔
- رحمٰن، خالد اور سلیم منصور۔ عورت خاندان اور ہمارا معاشرہ: مسائل اور لائحہ عمل۔ اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۲۰۰۷ء۔
- عمری، سیّد جلال الدین انصر۔ عورت اسلامی معاشرے میں۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، ۱۹۶۱ء۔
- مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ۔ پردہ۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۵۸ء۔
- مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ۔ تفہیم القرآن۔ لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۷۸ء۔
- مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ۔ حقوق الزوجین۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء۔

- اپادھیائے، وید پرکاش۔ کلکی اوتار اور محمد صاحب (scribed.com)۔
- احمد، اشفاق۔ مختلف معاشروں میں عورت کی حیثیت۔ القلم ڈاٹ آرگ۔

مطالعاتی گروپ اور خواتین۔ خاندان کا ادارہ: درپیش چیلنج۔ اسلام آباد انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۲۰۰۴ء۔

- *The Holy Bible, New and Old Testament (in Urdu)*. Revised Version, Series 93. Lahore: Pakistan Bible Society. (کتاب مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ)

Books:

Anway, Carol L. *Daughters of Another Path: Experiences of American Women Choosing Islam*. USA: Yawna Publications, 2002.

Bourke, Joanna. *Rape: A History from 1860 to Present*. London: Virago Press Ltd, 2007.

Griffin, David Ray. *Debunking 9/11 Debunking: An Answer to Popular Mechanics and Other Defenders of the Official Conspiracy Theory*. Olive Branch Press, 2007.

Haddad, Yvonne Yazbeck, Jane I. Smith and Kathleen M. Moore. *Muslim Women in America: The Challenge of Islamic Identity Today*. New York: Oxford University Press, 2006.

Hague, Gill and Ellen Malos. *Domestic Violence: Action for Change*. Cheltenham: New Clarion Press, 2005.

Jeans, James. *The Mysterious Universe*. UK: Cambridge University Press, 1930.

Nieuwkerk, Karin Van. *Women Embracing Islam: Gender and Conversion in the West*. Austin: University of Texas Press, 2006.

Ridley, Yvonne. *In the Hands of the Taliban*. Robson Books, 2003.

Reports:

Amnesty. "Sexual Assault Research." *Amnesty*, UK. (2005).

Clifton, Eli, Matthew Duss, Lee Fang, Scott Keyes, Wjahat Ali and Faiz Shakir. "Fear, Inc.The Roots of the Islamophobia Network in America." *Center for American Progress*. (August 26, 2011).

Department of Health. "Responding to Domestic Abuse: A Handbook for Health Professionals." *Department of Health, Statistical Bulletin*. (2005).

Dodd, Tricia, Sian Nicholas, David Povey, and Alison Walker. "Crime in England and Wales 2003-2004." *Home Office, Statistics on Domestic Violence, London*. (July 2004). http://tna.europarchive.org/20100413151426/homeoffice.gov.uk/rds/pdfs04/hosb1004.pdf (accessed April 18, 2012).

HM Government. "Cross-government Action Plan on Sexual Violence and Abuse." *Home Office London* (April 2007).

Manjoo, Rashida. "Report of the Special Rapporteur on Violence against Women, Its Causes and Consequences." *Human Rights Council: Seventeenth Session*. (June 1, 2011). http://www2.ohchr.org/english/bodies/hrcouncil/docs/17session/A.HRC.17.26. Add.5_AEV.pdf (accessed April 18, 2012).

Povey, David, ed. "Crime in England and Wales 2003/2004: Supplementary Volume 1: Homicide and Gun Crime." *Home Office, Statistical Bulletin*. (January 2005). http://webarchive.nationalarchives.gov.uk/20110218135832/ http://rds.homeoffice. gov.uk/rds/pdfs05/hosb0205.pdf (accessed April 18, 2012).

Rights of Women. "Forced Marriage: A Wrong Not A Right." *Rights of Women, Home Office and Foreign & Commonwealth Office*. (December 5, 2005).

Walby, Sylvia and Jonathan Allen. "Domestic Violence, Sexual Assault and Stalking: Findings from the British Crime Survey. *Home Office Research Studies*. (March 2004). http://webarchive.nationalarchives.gov.uk/20110218135832/rds.homeoffice. gov.uk/rds/pdfs04/hors276.pdf (accessed April 18, 2012).

Walby, Sylvia. "The Cost of Domestic Violence." *Women and Equality Unit*. (September 2004). http://www.devon.gov.uk/cost_of_dv_report_sept04.pdf (accessed April 18, 2012).

Newspapers:

Bayman, Hannah. "Yvonne Ridley: From Captive to Convert." *BBC*. September 21, 2004.

Booth, Lauren. "I'm now a Muslim. Why all the Shock and Horror?" *The Guardian*. November 3, 2010.

Booth, Lauren. "Why I Love Islam?" *Daily Mail*. November 1, 2010.

Brooks, Susan. "Fear of Islam: A study." *Washington Post*. August 30, 2011.

Cesari, Jocelyne. "Islam is a Religion, Not a Terror Ideology." *CNN*. August 24, 2010.

Gentleman, Melia. "Employers 'Targeting Pregnant Women for Redundancy." *The Guardian*. June 5, 2009.

Goodley, Simon. "Women Executives Could Wait 98 Years for Equal Pay." *The Guardian*. August 31, 2011.

Gould, Mark. "Market Forces." *The Guardian*. August 22, 2007.

Gould, Peter. "Scale of Domestic Abuse Uncovered." *BBC*. February 18, 2003.

Gutman, Huck. "Economic Inequality in US." *Dawn*. July 1, 2002.

Harman, Jane. "Sexual Assault in Military 'Jaw-Dropping, Lawmaker Says." *CNN*. July 31, 2008.

Hellen, Nicholas and Christopher Morgan. "Islamic Britain Lures Top People." *Sunday Times*. February 22, 2004.

Hockenos, Paul. "Europe's Rising Islamophobia." *Middle East Online*. April 24, 2011. http://www.middle-east-online.com/english/?id=45736 (accessed April 18, 2012).

Laville, Sandra. "Efforts Fail to Improve Rape Conviction Rates." *The Guardian*. July 21, 2007.

Taylor, Jerome and Sarah Morrison. "The Islamification of Britain: Record Numbers Embrace Muslim Faith." *Daily Independent*. January 4, 2011.

Townsend, Mark. "New Trafficking Laws 'Will Not Care for Slavery Victims." *The Guardian*. July 2, 2011.

Treanor, Jill. "Shocking' Lack of Women Top Company Directors." *The Guardian*. October 31, 2011.

Ward, Lucy. "Half Rape Crisis Centers Face Closure Threat." *The Guardian.* July 3, 2007.

Wildman, Sarah. "Islamophobia Imported From Europe: An Ugly Trend Gets Uglier." *Politics Daily.* August 28, 2010.

Other Web Sources:

Armario, Christine. "US Latinas Seek Answers in Islam." *The Christian Science Monitor.* December 27, 2004. http://www.csmonitor.com/2004/1227/p11s02-ussc.html (accessed April 18, 2012).

Ford, Peter. "Why European Women are turning to Islam." *The Christian Science Monitor.* December 27, 2005. http://www.csmonitor.com/2005/1227/p01s04-woeu.html (accessed April 18, 2012).

Hardy, Amy and Miles Moffeit. "Betrayal in the Ranks." *The Denver Post: Digital News Book*, November 16-18, 2003. http://extras.denverpost.com/justice/tdp_betrayal.pdf (accessed April 18, 2012).

Karbon, Riley and Field Intern. "Working Conditions For Women in US Lag Behind Europe." *NOW Blogs for Equality.* (February 2011). http://www.now.org/news/blogs/index.php/sayit/2010/02/11/working-conditions-for-women-in-u-s-lag-behind-europe (accessed April 18, 2012).

Kay, Jeanne. "Europe's Islamophobia." *Foreign Policy in Focus.* April 9, 2010.

Kelly, Liz. "Three Times the Number of Lap-dancing Clubs as Rape Crisis Centers." *End Violence against Women Blog.* March 6, 2007. http://endviolenceagainstwomen.blogspot.com/2007/03/three-times-number-of-lap-dancing-clubs.html (accessed April 18, 2012).

Makow, Henry. "Bikini vs. Burka: The Debauchery of Women." *Pakistanpal's*

Blog South Asian Research & Analysis / News Blog. September 24, 2009. http://pakistanpal.wordpress.com/2010/02/15/bikini-vs-burka-the-debauchery-of-women/ (accessed April 18, 2012).

Naik, Zakir (speech). "Women's Rights in Islam - Modernizing or Outdated?" *Salilan Muslim*. October 20, 2011. http://www.sailanmuslim.com/news/women-rights-in-islam-modernising-or-outdated (accessed April 21, 2012).

Neill, Terry O'. "Gender Wage Gap, Current Threats to Economic Justice Linked." *National Organization for Women*. April 12, 2011. http://www.now.org/press/04-11/04-12.html (accessed April 18, 2012).

Ridley, Yvonne. "How I Came to Love the Veil." *The Washington Post*. October 22, 2006.

Shakinovsky, Tania. "Sick of Superwoman." *Mail Online*. no. 123003. http://www.dailymail.co.uk/news/article-123003/Sick-Superwoman.html (accessed April 18, 2012).

Sinclair, Ian. "Violence Against Women," *ZNet*, December 12, 2007. http://www.zcommunications.org/violence-against-women-by-ian-sinclair (accessed April 18, 2012).

نئی کتابوں کے تعارف وتبصرہ پر مشتمل ششماہی مجلّہ
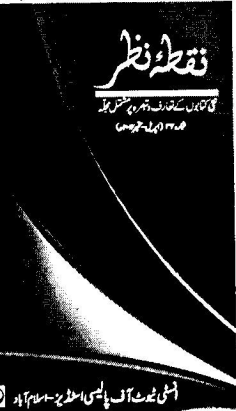
- خاص موضوعات: اسلام، ثقافت، تاریخ، مسلم دنیا، تصوف، ادب وغیرہ
- پاکستان میں تبصرۂ کتب کا پہلا اور اب تک واحد مجلّہ
- ۱۹۹۶ء سے بلاناغہ اشاعت

پاکستان میں: فی پرچہ ۲۵۰ روپے، سالانہ ۴۰۰ روپے (بذریعہ عام ڈاک) سالانہ ۴۵۰ روپے (بذریعہ کوریئر)

بیرون ملک: فی پرچہ ۱۵ امریکی ڈالر، سالانہ ۲۲ ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔اسلام آباد

1، گلی نمبر 8، F-6/3، اسلام آباد

فون: 051-8438391-3، فیکس: 051-8438390

ای میل: publications@ips.net.pk، ویب سائٹ: www.ips.org.pk

عورت، مغرب اور اسلام

ایک طرف، مغرب میں اسلام کو دہشت گردی کا علم بردار اور عورتوں کے حقوق کی پامالی کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے، عورتوں کے لیے حجاب کی اسلامی روایت کے خلاف جارحانہ مہم چلائی جاتی ہے۔

دوسری طرف، مغربی ملکوں میں قبولِ اسلام کے واقعات کی رفتار حیرت انگیز ہے اور اس میں بھی عورتوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ یہ پہلو، سوچ بچار کا بڑا سامان رکھتا ہے!

آج مغرب کی عورت کن مسائل سے دوچار ہے اور اُسے اسلام میں کیا خوبی نظر آتی ہے؟ کیا مسلم معاشرہ دنیا کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کر رہا ہے؟ اسلام میں عورت کا کیا مقام ہے؟ آج عورت کے حوالے سے انسانیت کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ اس مطالعہ میں یہ اور اس نوعیت کے دیگر سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد ایک آزاد، غیر سیاسی، علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو ملکی، بین الاقوامی اور اسلامی دنیا سے متعلق پالیسیوں پر تحقیق اور مکالمے کا اہتمام کرتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے دائرہ کار میں ٹیکنالوجی اور حکمت عملی سمیت اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور اسلامی امور سے متعلق ملکی اور بین الاقوامی پالیسیاں زیر بحث آتی ہیں۔ ادارے کا مقصد متعلقہ اُمور پر غیر حکومتی سطح پر مکمل آزادی کے ساتھ تحقیق اور بحث مباحثہ کرنا اور مطالعہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ کی روشنی میں متبادل لائحہ عمل پیش کرنا ہے تاکہ پالیسی ساز ادارے اس کی روشنی میں بہتر فیصلے کر سکیں۔

اہم سماجی، سیاسی و اقتصادی موضوعات اور عصری مسائل پر انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اب تک ۲۰۰ سے زائد کتب شائع ہوئی ہیں جبکہ ۱۱۰۰ سے زائد رپورٹیں بھی پیش کی جا چکی ہیں۔ ''مغرب اور اسلام'' کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام دو علمی جرائد ''نقطہ نظر'' اور "Policy Perspectives" بھی شائع ہوتے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
۱، گلی نمبر ۸، ایف سکس تھری - اسلام آباد
فون: ۳-۸۴۳۸۳۹۱، فیکس: ۸۴۳۸۳۹۰
ویب سائٹ: www.ips.org.pk